تصوف اور صوفیا کی تاریخ

عرب سے ہندوستان تک



ڈاکٹر محمد حفیظ الرحمٰن

تصوف اور صوفیا کی تاریخ

عرب سے ہندوستان تک

ڈاکٹر محمد حفیظ الرحمٰن

شاکر پبلی کیشنز
اردو بازار لاہور
فون: 0322-22 22 740

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

تصوف اور صوفیاء کی تاریخ

باہتمام ملک محمد شاکر

سن اشاعت محرم/نومبر 2014

طابع اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور

قیمت -/180 روپے

ملنے کا پتہ:

نظامیہ کتاب گھر
بیسمنٹ اردو بازار لاہور 0301-4377868

شبیر برادرز
اردو بازار لاہور فون: 042-7246006

احمد بک کارپوریشن
اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5568320

اسلامک بک کارپوریشن
اقبال روڈ نزد کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5536111

ضروری التماس

قارئین کرام! ہم نے اپنی بساط کے مطابق اس کتاب کے متن کی تصحیح میں پوری کوشش کی ہے، تاہم پھر بھی آپ اس میں کوئی غلطی پائیں تو ادارہ کو آگاہ ضرور کریں تاکہ وہ درست کر دی جائے۔ ادارہ آپ کا بے حد شکر گزار ہوگا۔

فہرستِ مضامین

تیسرا باب : ہندوستان میں صوفی تحریک اور صوفیاء کے کارنامے

چوتھا باب : خانقاہوں کا قیام اور ان کی سماجی اہمیت

پانچواں باب : دھلی سلطنت کے سلطانوں کا صوفیاء سے تعلق

چھٹا باب : مغل بادشاہوں کا صوفیاء سے تعلق

ساتواں باب : ہندوستان میں درگاہ کے قیام کی روایت

آٹھواں باب : عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کا درگاہوں سے تعلق

نواں باب : عہدِ مغل (1526-1707ء) کے حکمرانوں کا درگاہوں سے تعلق

دسواں باب : ہندوستانی معاشرے میں درگاہوں کی اہمیت

گیارھواں باب : تصوف سے مسلمانوں میں اختلاف کے اسباب

بارھواں باب : ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں کا اسلامی نظریہ

تیرھواں باب : جدید دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں تصوف کی اہمیت وضرورت

چودھواں باب : تصوف کی نظر میں علم کا مطلب

پندرھواں باب : ڈپریشن سے بچاؤ کی صوفیانہ تدبیریں

سولھواں باب : صوفیاء کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت

☆☆☆

پیش لفظ

تصوف کے سلسلے میں بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، جنھیں تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول تصوف اور صوفیاء کی تعریف کی شکل میں لکھی گئی ہیں۔ دوسری جو تصوف اور صوفیاء کے خلاف لکھی گئی ہیں، لیکن دونوں ہی حقائق کی سطح سے دور ہیں۔ تیسرے درجے کی کتابیں وہ ہیں جنھیں صوفیاء نے لکھا ہے۔ جو عربی اور فارسی زبان میں ہیں، جن کو سمجھنا موجودہ وقت کے علماء کے لئے بھی مشکل ہے۔ ان میں سے چند کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے ہیں، لیکن ان ترجموں میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے، جس سے عام آدمی کو سمجھنا مشکل ترین ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ علماء، تصوف اور صوفیاء کے سلسلے میں مسلم سماج میں بھرم پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مسلم سماج میں کچھ لوگ تصوف اور صوفیاء کے ذریعہ کئے گئے کام کو غیر اسلامی سمجھنے لگے۔ اسی نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، تاکہ تصوف اور صوفیاء کو لوگ صحیح طرح سے سمجھ سکیں۔

موجودہ مسلم سماج میں کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ تصوف کا تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ صوفیاء کے ذریعہ انجام دیئے گئے کردار اور تصوف لفظ کا ذکر قرآن اور حدیث میں کہیں بھی نہیں ملتا ہے۔ اس کا تعلق ہندو دھرم اور بودھ دھرم سے ہے۔ اس مطالعہ میں اس نظریہ کی تردید کی گئی ہے، اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ صوفیاء کے ذریعہ کئے گئے عمل اور تصوف کا تعلق اسلام سے ہے، ساتھ ہی اس کا تعلق حضرت محمد ﷺ کی عام زندگی سے بھی ہے اور تصوف کو عملی زندگی میں لانے کے لئے قرآن میں کئی جگہوں پر ذکر کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں بڑی وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے کہ تصوف کیا ہے؟ تصوف کا تصور کہاں سے اور کن حالات میں ہوا۔ تصوف کا فروغ کیسے ہوا اور کیسے دھیرے دھیرے یہ تحریک کی شکل اختیار کر لی اور کس طرح پورے خطۂ ایشیا پر چھا گیا۔ ان صوفیاء کا سلطنت سے تعلق تھا یا نہیں؟ اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں عہدِ وسطیٰ کے حکمرانوں سے یہاں کے صوفیاء کے کیسے رشتے تھے؟ ان حقائق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان میں موجود خانقاہ اور درگاہ کے سماجی ربط اور اس کے کام اور ردعمل پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عہدِ وسطیٰ کا ان درگاہوں سے تعلق تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو کن سلطانوں اور بادشاہوں نے ان درگاہوں سے دلچسپی لی۔ دہلی میں تعمیر خان جہاں تلنگانی کا مقبرہ، اتگا خاں کا مقبرہ، عیسیٰ خاں کا مقبرہ، ہمایون کا مقبرہ، چونسٹھ کھمبا

مقبرہ، یہ سبھی مقبرے غیاث پور میں ہی کیوں قائم ہوئے؟ وجہ یہ ہے کہ ان کو شیخ نظام الدین اولیاء سے عقیدت تھی، جس کے سبب یہ سبھی مقبرے غیاث پور میں شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ اور درگاہ کے قریب ہی تعمیر کیے گئے۔

خانقاہ اور درگاہ میں کیا فرق ہے؟ خانقاہ کے کیا کام تھے، اور ہندستانی سماج پر اس کا کیا اثر پڑا؟ درگاہ قائم کرنا یا پختہ قبریں بنانا اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہوتے ہوئے بھی اسے کیوں بنایا گیا، کس بنیاد پر یہ کام کیا گیا؟ ان درگاہوں کا ہندوستانی سماج سے کیا تعلق ہے؟ اور اس کا کیا اثر پڑا؟ ان سبھی سوالوں کے جواب اس مختصری کتاب میں دیے گئی ہے۔

صوفیاء کے ذریعہ لکھے گئے ملفوظات اور تذکرے جیسی کتابوں کی کیا اہمیت ہے؟ کیا یہ ایک مذہبی کتاب ہے،؟ کیا ان کے مطالعہ کرنے سے اس دور کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی نیز سیاسی مسائل کا علم حاصل ہو سکتا ہے؟ یہ ایک مؤرخ کے تاریخ لکھنے میں معاون کتاب ہوگی۔ ساتھ ہی موجودہ حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ جدید دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں تصوف کی کیا اہمیت ہے۔ ان سارے پہلوؤں پر مکمل طور پر روشنی ڈالی گی ہے۔ امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب تاریخ کے طالب علم اور ریسرچ اسکالر کے لئے مددگار ثابت ہوگی اور تصوف اور صوفیاء کرام سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی پسند آئے گی۔

اس مقالہ کی تکمیل کے لئے میں اپنے استاد محترم پروفیسر ایس ایم عزیز الدین حسین، پروفیسر نثار احمد فاروقی اور پروفیسر غلام یحییٰ انجم کا بے حد شکر گزار ہوں جن لوگوں کی مشورے سے اس کام کا آغاز ہوا۔

یہ کتاب ''یونیورسل صوفی سنت اسٹڈی اینڈ پیس فاؤنڈیشن C-210، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی کے تحقیقی پروگرام کے تحت ہندی سے اردو زبان میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس فاؤنڈیشن کو اب تک تصوف اور صوفیا کرام کی تاریخ نیز اسلامی فن تعمیر کے تعلق سے 20 سے زیادہ کتابیں شائع کروانے کا شرف حاصل ہے۔

میں قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان (NCPUL) نئی دہلی کا بے حد شکر گذار ہوں جس کے مالی تعاون سے یہ کتاب شائع ہو سکی۔

ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن
کوآرڈینیٹر: یونیورسل صوفی سنت اسٹڈی اینڈ پیس فاؤنڈیشن
سی۔210، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی، 25

مقدمہ

اسلام میں جن تین امور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ان میں ایمان واسلام کے علاوہ احسان بھی ہے۔ایمان واسلام (عمل) کے تعلق سے چوں کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یا ایھا اللذین آمنوا و اعملو االصالحات کے ذریعہ تلقین کی گئی ہے اور سیکڑوں آیات میں اس کی اہمیت، افادیت، اثرات وثمرات کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے لوگ ایمان اور اسلام کے نام سے عوام وخواص سب واقف ہیں، قرآن کریم میں جس کثرت سے ایمان واسلام کا ذکر ہے اس کثرت سے احسان کا ذکر نہیں، اس لئے اس سے عوام کی واقفیت نہیں صرف خواص ہی واقف ہیں حالانکہ اس احسان کا تعلق ایمان اور اسلام سے بڑا گہرا ہے کیوں کہ حسن ایمان اور حسن اسلام یعنی حسن عمل ہی کا نام احسان ہے۔نماز کی ادائیگی خدا کے بیشتر بندے کرتے ہیں مگر اللہ کے مقربین کی نمازوں میں جو اخلاص اور حسن ہوتا ہے وہ عام لوگوں کی نمازوں میں کہاں؟ اسی لئے حدیث جبرئیل کی روشنی میں جس میں اللہ کے نبی ﷺ سے ایمان۔اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کیا گیا تھا نماز کے تین درجے مقرر کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔نماز کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ شرائط فقہ کے ساتھ تمام ارکان ادا کر لئے جائیں اس سے عام آدمی سبک دوش ہو جاتا ہے۔یہ عوام کے لئے ہے اور دور حاضر میں بیشتر نمازیں اسی انداز کی ادا کی جاتی ہیں۔

۲۔عبادت میں کم از کم یہ تصور ہو معبود ہمیں دیکھ رہا ہے۔یہ خواص کا مقام ہے۔عہد حاضر میں ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

۳۔عبادت میں یہ حضور وشہود ہو گویا عابد معبود کو دیکھ رہا ہے۔یہ اخص الخواص کا مقام ہے۔عہد حاضر میں ایسے لوگ عنقا ہیں۔

اس توضیح کی روشنی میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ایمان وعمل کا حسن ہی احسان ہے اگر یہ حسن عبادت میں نہ ہو تو عبادت میں محض ظاہری افعال باقی رہ جائیں گے نہ اس میں ذوق ہوگا نہ نورانیت اور

نہ اس میں شوق ہوگا نہ روحانیت جس کی طرف اشارہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے اس شعر میں کیا ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو مری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

ہر نمازی کی نماز میں یہ کیفیت نہیں پیدا ہوتی جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا، بلکہ اس کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں اس نغمہ کو ہر ساز پر نہیں چھیڑا جاتا۔ نماز کی اس کیفیت سے سرشار انبیاء، اولیاء اور صلحا ہی ہوتے ہیں۔ سطور بالا میں جس کیفیت کو احسان کا نام دیا گیا ہے اسی کو دور حاضر میں تصوف کہا جاتا ہے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

''تصوف بعرف شرع نام او احسان است'' (ازالۃ الخفاء جلد۲ ص۱۴۲) (تصوف کو عرف شرع میں احسان کہتے ہیں)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے احسان کی تشریح میں حضرت امام مالک کا ایک قول نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''جس نے فقہ کے بغیر تصوف حاصل کیا وہ زندیق ہوا اور جس نے تصوف سیکھے بغیر فقہ کا علم حاصل کیا وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوا۔''

حدیث جبرئیل میں ایمان اسلام اور احسان کے در پردہ فقہ، کلام اور تصوف کا بیان ہوا ہے کیوں کہ حدیث جبرئیل میں ایمان سے مراد کلام ہے جس میں عقائد سے بحث ہوتی ہے اور اسلام سے مراد فقہ ہے جس میں شریعت کے احکام اور اعمال کا بیان ہوا ہے اور احسان سے مراد اصل تصوف ہے جو صدق اور توبہ الی اللہ سے عبارت ہے۔ مشائخ کرام کے تمام ارشادات کا حاصل یہی احسان ہے۔
(اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ ص ۴۵)

حدیث جبرئیل میں سوال کی ترتیب اس بات پر غماز ہے کہ وہی ایمان و عمل بارگاہ خداوندی میں مقبول ہے جس میں حسن اور اخلاص ہو اسی وجہ سے ہمارے اسلاف نے اخلاص فی العمل کو سلوک اور طریقت کا نام دیا ہے۔

اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بندہ کا دل ہر طرح کی آلائشوں سے پاک و صاف ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب و سنت پر مکمل طور سے عمل پیرا ہو اس لئے کہ ایمان و عمل کے تمام محاسن کا تعلق قلب سے

ہے۔ اسی وجہ سے بعثت نبوی کے جملہ مقاصد میں تزکیہ نفس اور تزکیہ قلب ویزکیھم کے ذریعہ ایک مقصد قرار دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں

ان فی جسد الانسان مضغة فان صلحت صلح الجسد کله وان فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب (بے شک انسان کے بدن میں گوشت کا ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہے تو پورا جسم درست ہے اور خراب تو پورا جسم خراب ہے وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے)

سیرت نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ قلب کے لئے بندہ کو شریعت کے اوامر پر پابندی اور نواہی سے اجتناب لازم ہے اگر بندہ توبہ، صبر، شکر، رجا، توکل، خوف الٰہی، محبت الٰہی، اخلاص، زہد، رضا،، حیا،، حلم، عفو، توحید، مراقبہ، محاسبہ، خاموشی، قناعت، طہارت، صدق، اور ذکر وفکر پر اخلاص قلب کے ساتھ عمل اور تمام آفات لسانی کذب، چغلی، غیبت، بہتان تراشی، بدگوئی فحش کلامی، خوشامد پرستی۔ شہوت، ریا کاری، مکاری، تکبر، حب دنیا، غضب، بخل جیسے ان تمام اخلاق ذمیہ سے اجتناب لازم ہے جو تزکیہ قلب کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ کیونکہ جب قلب رزائل سے محفوظ ہو، اعمال صالحہ جزء بدن بن جائیں اور بندہ اپنے محبوب حقیقی کو پہچاننے لگے غیر اللہ کا خیال دل میں جگہ نہ پا سکے اور اس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ محبت الٰہی سے سرشار ہو جائے تو ایسی صورت میں بندہ صرف بندہ نہیں بلکہ وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے اور اس کا دل تجلیات ربانی کا گنجینہ بن جاتا ہے۔ جس کے سبب اس کی زبان پر ذکر حق جاری ہو جاتا ہے جس کی طرف اشارہ قرآن کریم نے ان لفظوں میں کیا ہے۔ یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم (آل عمران ۱۹۱) اور یہی بندے رکوع میں جھک کر اور سجدے میں گر کر اس آیت تراھم رکعاً وسجداً یبتغون فضلامن اللہ ورضوانا (الفتح ۲۹) اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں۔

جو خدا کے نیک بندے ان اوصاف حمیدہ سے آراستہ ہوتے ہیں ان کی طویل فہرست ہے اس موضوع پر تصوف سے دلچسپی رکھنے والے قلم کاروں کے نوک قلم سے متعدد تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن کی تفصیل اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تصوف جن کیفیات پر مشتمل ہے اس کا آغاز ہمارے نبی ﷺ کی ذات گرامی سے سرزمین عرب سے ہوا اور رفتہ رفتہ اس نور نبوت کی کرنوں سے ہندوستان کا چپہ چپہ روشن ہو گیا۔ صحابہ، تابعین، تبع

تابعین یعنی خیر القرون کے جو لوگ تھے ان کے واسطے سے یہ روشنی ہندوستان پہنچی۔ اللہ کے یہ نیک بندے کبھی تجارت کی غرض سے اور کبھی فوجی بن کر ہندوستان میں اشاعت اسلام کی غرض سے قدم رکھا۔ اور کبھی صرف اور صرف داعی اسلام کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور لاکھوں بندگان الٰہی کو کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کے اجالے میں لا کھڑا کیا کیوں کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ پورے ہندوستان میں بت پرستی عروج پر تھی بقول تاریخ فرشتہ کفار کا عقیدہ تھا۔

> ''جو شخص اپنے بزرگوں کی سونے چاندی یا پتھر کی شبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ سیدھے راستے پر ہوتا ہے اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگا خود راجہ سورج نے دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کی رعیت نے بھی اپنے فرماں روا کی تقلید کی اور ہر کوئی اس مشرب کے مطابق اپنے اپنے طور پر بت پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) ہندوستان میں بت پرستوں کے نوے مختلف گروہ پیدا ہو گئے''۔ (تاریخ فرشتہ اردو جلد اول ص ۶۵)

جب ہندوستان میں عرب تجار، مجاہدین اور مشائخ کے ذریعہ اسلام کی داغ بیل پڑ گئی تو سیرت نبوی کے وہ تمام محاسن جن سے یہ اللہ کے نیک بندے آراستہ تھے اس کی مکمل چھاپ ہندوستان کے باشندوں پر پڑنی لازم تھی جو مشائخ وصوفیا تاجر یا فوجی بن کر ہندوستان آئے ان کی تو میں بات نہیں کرتا البتہ جو صوفیاء و مشائخ خالص داعی اسلام کی حیثیت سے ہندوستان میں اپنے قدم جمائے ان کی بھی طویل فہرست ہے جن میں حضرت شیخ علی ہجویری معروف داتا گنج بخش لاہوری۔ حضرت سیدنا سالا مسعود غازی بہرائچ شریف۔ حضرت سید محمد قطب الدین مدنی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت سیدنا سیف الدین عبد الوہاب جیلانی، مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ نور الدین مبارک غزنوی، حضرت جلال الدین سرخ بخاری، حضرت شہاب الدین جگ جوت خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسے کئی مشائخ ہیں جو ہندوستان میں باہر سے آئے اور اپنی شبانہ روز مساعی سے ہندوستان کو نور اسلام سے منور و درخشاں بنا دیا۔ زیر نظر کتاب میں عرب سے ہندوستان تک جو تصوف کی سرگرمیاں مختلف ادوار میں مختلف انداز میں نظر آتی رہی ہیں انہی کی تفصیلات پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن نے اپنی صلاحیت کے مطابق سلیقے سے مرتب کیا

ہے۔اور ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ کس سلطان کے دور حکومت میں کس صوفی اور شیخ نے اپنی داعیانہ اور مجاہدانہ سرگرمیوں سے پرچم اسلام کو بلند و بالا رکھا،اس کے دور میں سلطان کے رعایا سے مراسم وتعلقات کس نوعیت کے تھے؟اور سلاطین وقت نے ان صوفیاء ومشائخ سے کس قدر استفادے کیے ان کی خانقاہوں ودرگاہوں سے ان کے روابط حاکمانہ تھے یا نیازمندانہ؟۔ایسی بہت سارے مباحث ہیں مصنف نے جنہیں اس کتاب میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔کتاب کے آخر میں اپنی کج فہمی کے باعث جو تصوف کے اسرار ورموز سے عدم واقفیت کی بنا پر مخالفت کرتے ہیں ان کا بھی منصفانہ جائزہ لیا ہے۔ساتھ ہی جدید دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں تصوف کی اہمیت اور ضرورت پر بھی اچھی روشنی ڈالی ہے۔اس طرح 248 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اپنے اندر کئی ایسی اہم بحثیں سموئے ہوئے ہے جن کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جنہیں تصوف اور ارباب تصوف سے والہانہ لگاؤ ہے۔کتاب اپنے موضوع پر بھرپور ہے اس کے لئے مصنف کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔اگر کمپوزنگ کی اغلاط درست کرلی جائیں تو کتاب کا تحقیقی حسن مزید دوبالا ہو جائے گا امید ہے مصنف اس طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔

پروفیسر غلام یحیٰی انجم
ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ سوشل سائنسز
جامعہ ہمدرد (ہمدرد یونیورسٹی) نئی دہلی

۱۷ر ستمبر ۲۰۱۲ء

پہلا باب

تصوف کیا ہے

تصوف کیا ہے؟ اس سلسلے میں محققین نے الگ الگ طریقوں سے وضاحتیں کی ہیں، جس کا تذکرہ آگے کیا گیا ہے۔ حقیقت میں تصوف قرآن کے حکم کے مطابق پیغمبر حضرت محمدؐ کی عملی زندگی کے ذریعہ اپنائے گئے اس عمل کا نام ہے، جسکے مطابق نبی کے پاکیزہ کردار اور شیریں اخلاق کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا نیز تزکیۂ نفس کے مطابق اپنی روح کو پاک کرنا اور نفس امارہ کے اثر سے نجات پانے کے لئے خوف اور امید کے ساتھ عبادت میں مشغول ہو کر خدا سے محبت اور قربت حاصل کرنے کے لئے اور اس کی مدد حاصل کرنے کے لئے، خود کو اس پر قربان کرنے کے جذبے کو اپنے اندر پیدا کرنے کا وہ طریقہ ہے، جو نبی حضرت محمدؐ نے اپنائی اور بتائی، اس طریقے کے مطابق عمل کرنے کا نام تصوف ہے۔

دوسرے لفظوں میں تصوف اس طریقے کا نام ہے، جس کے مطابق ایک آدمی دنیاوی خیالات سے آزاد ہو کر مکمل طور سے خدا کے پرد اپنے آپ کو کر دے۔ اس عمل کا تعلق نبی حضرت محمدؐ کے ان اعمال سے منسوب ہے جب آپ ایک مخصوص وقت میں غارِ حرا میں جا کر عبادت میں مشغول ہو جایا کرتے تھے[1]۔

پیغمبر حضرت محمدؐ قرآن کی تعلیم دینے اور حکمت کے ساتھ تزکیۂ نفس کے طریقے کو بتانے کے

لئے بھیجے گئے تھے۔تزکیہ کے مطابق ایک آدمی روحانی پاکیزگی اور خلوص نیت سے خدائے حکم کو انجام دے اور ہر وقت خدا سے ڈرے۔ برائی سے بچنے کی کوشش کرے۔ اپنے نبی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ریاضت کر کے اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش خود کے اندر پیدا کرے۔ساری برائیوں سے بچے۔اپنے کردار میں ایمانداری، انصاف، معیاری اخلاق اور خوش اسلوبی نیز قوت برداشت کو اپنے اندر پیدا کرے۔یہ ساری باتیں تزکیہ نفس کے بعد ہی حاصل ہوتی ہیں۔یہی کام تصوف کا ہے۔جس کا ذکر قرآن میں کئی جگہوں پر کیا گیا ہے۔قرآن میں اللہ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے، جو نماز اس طرح سے پڑھیں کہ وہ اس قادر مطلق کو جان کر اس کے سامنے رو رو کر، اپنے گناہوں کی معافی چاہیں اور خدا کی مدد کے لئے درمیان رات میں اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جائیں۔ ''ایسے لوگوں کو میں یقیناً پسند اور ان کی تعریف کرتا ہوں''۔

تصوف کا ارتقاء

تصوف اور صوفی کے حقائق بیان کرنے میں مختلف انداز اپنایا گیا ہے اور اس سلسلے میں اہل علم نے اپنے الگ الگ خیالوں کا اظہار کیا ہے۔اس موضوع کو مختلف زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اسلام میں تصوف کی تعریف کے تعلق سے محققین کے مختلف خیالات ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اسلام میں اس کا داخلہ عیسائی مذہب، بودھ مذہب، ہندو مذہب اور پارسی مذہب کی سطح سے ہوا ہے۔لیکن اسلامی تصوف کے محققین کا کہنا ہے کہ اسلامی تصوف کا ربط قرآن اور پیغمبر حضرت محمد کی زندگی اور ان کے عمل سے ہے [2]۔ پروفیسر لوئس میسی نون، جو اسلامی تصوف کے تبصرہ کے لئے خاص طور سے دسترس حاصل کرنے والے محقق مانے جاتے ہیں' نے اپنی تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف کا ماخذ حقیقی طور سے حدیث اور قرآن ہے اور یہ تحریک مکمل طور پر اسلامی ہے [3]۔

پروفیسر ولور فورس کلارک اور لوئس میسی نون کا خیال ہے کہ ہر فرقے یا مذہب کے ماننے والوں کی زندگی کسی نہ کسی وقت اپنے رب کی طرف لازمی طور پر متوجہ ہوتی ہے۔یہ انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ روحانی صفائی کی راہ تلاش کر کے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جائے [4]۔ مطلب یہ ہے کہ پروفیسر ولور کلارک اور لوئس میسی نون کے مطابق، تصوف کے طریقے اختیار کرنے کی

خواہش فطری طور سے انسان میں پیدا ہوتی ہے۔اس لئے اگر محققین نے اس کا ربط بودھ، عیسائی، پارسی اور ہندو مذاہب سے جوڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ اگر تصوف کا ربط بودھ اور ہندو مذہب سے ہے تو اس کا ربط اسلام مذہب سے کیسے ہو سکتا ہے؟اس سلسلے میں قرآن میں ذکر ہے کہ:

"مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِرُسُلٍ مِنْ قَبْلِكَ" (سورۃ حٰم: السجدۃ الآیت 42)

ترجمہ: اے محمد تم سے اس کتاب قرآن میں وہی کہا گیا ہے جو تم سے پہلے کے پیغمبروں سے کہا گیا تھا[5]۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْنَا ، مَا اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرَاهِيمَ وَ اِسْمٰعِيلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوبَ وَ الاسباطِ وَ مَا اُوتِيَ مُوسٰى وَ عِيسٰى ، مَا اُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَاِنْ اٰمَنُوا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ۔ (سورۃ بقرۃ، الآیت 136)

ترجمہ: اسی طرح سورۃ بقرہ میں ذکر ہے کہ "اے مسلمانوں کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہمارے طرف اترا اور جو ابراہیم، اسماعیل پر اور اسحاق پر، یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا۔ اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور سارے پیغمبروں کو، ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائیں (یقین کریں)۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔ اگر یہ بھی اسی طرح سے مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھا راستہ پایا اور جنہوں نے اسے جھٹلایا وہ صرف ضد پر ہیں[6]۔

قرآن میں مذکور اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کہنا یا سوچنا غلط ہے کہ اسلام میں جن حقائق کا تذکرہ ہے ان کا کسی اور مذہب سے تعلق نہیں ہو سکتا، بلکہ اسلام بھی مذہبوں کے مجموعی عناصر کی شکل میں نازل ہوا ہے' اگر اس کے کچھ عناصر دیگر مذہبوں سے ملتے جلتے دکھائی دیتے ہیں، تو یہ حیرت اور تشویش کی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ اگر تصوف کا طرزِ عمل کسی دیگر مذہب سے ملتا ہے تو یہ سمجھنا کہ یہ دوسرے مذہبوں سے لے کر اپنایا گیا ہے، اس کے طریقے غیر اسلامی ہیں۔ ایسا کہنا یا سوچنا غلط ہوگا۔

محققین کی نظر میں لفظ صوفی کی ارتقاء

صوفی لفظ کے معرضِ وجود میں آنے کے تعلق سے محققین نے مختلف دلیلوں کی بنیاد پر نیز مختلف لفظوں سے جوڑ کر وضاحت کرنے کی کوشش کی ہیں جو اس طرح سے ہیں۔

صفا: اس کا مطلب ہے پاکیزگی یعنی روحانی پاکیزگی یعنی جو لوگ پاکیزگی اور روحانی صفائی پر زیادہ زور دیتے تھے، انہیں صوفی کہا گیا۔

اہل صفہ: وہ لوگ جو نبی حضرت محمدؐ کے زمانے میں مسجد نبوی میں ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے تھے، انہیں ہی صوفی کہا گیا۔

صف: صف کہتے ہیں قطار یا لائن کو۔ چونکہ یہ لوگ نماز کے اوقات میں ہمیشہ اگلی صف میں ہوتے تھے، لہٰذا ان کو صوفی کہا جانے لگا۔

صوفہ: ایک قدیم قبیلہ تھا، جو کعبہ کا خادم تھا۔ جو کعبہ کی صفائی پر خاص خیال رکھتا تھا اور ذکر و فکر میں مشغول رہتا تھا،، انہیں صوفی کہا گیا۔

شیوصوفیا: یہ یونانی لفظ ہے، جس کا مطلب ہے حکمت الٰہی۔ مطلب وہ لوگ جو قرآن اور حدیث میں مذکورہ باتوں پر محققانہ سوچ و فکر رکھتے تھے، انہیں صوفی کہا گیا۔

صوف: اس کا مطلب ہوتا ہے ''اون'' مطلب عرب اور ایران میں کچھ لوگ ایسے تھے، جو ہر وقت اون کے لباس پہنے رہتے تھے، انہیں ہی صوفی کہا گیا7۔

مذکورہ تمام ہی باتیں، لفظوں کی بنیاد پر محققین نے اپنی دلیلیں دیں ہیں اور ان ہی نظریوں سے صوفی لفظ کو صوفی یا تصوف سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔

"لفظ صوفی یا تصوف کے وجود کے سلسلے میں مورخ ابوریحان البیرونی نے لکھا ہے کہ یونان میں صوفی فلاسفر کو کہتے ہیں۔ اسلام میں ایک گروپ ایسا تھا جو اسلامی نظریہ کو محققانہ و مفکرانہ انداز میں غور و فکر کرتا تھا، ان کو صوفی کہا گیا8۔

اس سلسلے میں امام قشیری نے اپنی ایک تحقیق پیش کی ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے بعد ان کے قریب رہنے والوں کو 'صحابہ' کہا گیا اور صحابہ کے رابطے میں اور قریب رہنے والوں کو تابعین کہا گیا۔ اس کے بعد کے لوگوں کو تبع تابعین۔ اس کے بعد لوگ مختلف فرقوں میں بٹتے چلے

گئے۔ان مختلف فرقوں میں جن کا رجحان دین (مذہب) کی طرف زیادہ تھا، انہیں زاہد اور عابد کے نام سے پکارا گیا، لیکن جب بدعات پیدا ہوئی اور مختلف طرح کی بدعتیں معاشرے میں جڑ پکڑنے لگیں، ایسی صورت حال میں جس فرقے میں تقویٰ (خدا سے خوف) زیادہ تھا انہیں ہی اہل سنت یعنی صوفی کہا گیا[9]۔

تصوف کی حقیقت قرآن اور حدیث کی روشنی میں

صوفیاء نے اپنے ہر کام اور عمل کو قرآن اور حدیث کے ذریعہ دی گئی ہدایت کے مطابق ہی کیا۔ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں خدا نے کئی جگہوں پر کہا ہے "تم خدا سے محبت کرو، خدا تم سے محبت رکھتا ہے"۔جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ و یَغْفِرْلَکُم ذُنوبَکُم وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْم۔

ترجمہ: اگر تم سچے دل سے اللہ سے محبت رکھنے والے ہوتو تم میری پیروی کرو (میرے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کرو) اس سے صرف یہی نہیں ہوگا کہ تم اللہ سے محبت کرنے والے ہو جاؤ گے، بلکہ خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے گا[10]۔

خدا کے لئے خود کو سپرد کر دینے والے کردار کے سلسلے میں صوفیاء کا کہنا ہے کہ اللہ نے قرآن میں بار بار یہ کہا ہے کہ "تم خدا کی عبادت کرو، خود کو اس کی عبادت میں ہر وقت مشغول رکھو"، جس سے ترغیب پاکر ایک جماعت "نبی حضرت محمد ﷺ کی زندگی میں ہی ہر وقت مسجد نبوی میں خدا کی عبادت میں مشغول رہنے لگی، جن کو اہل صفہ کہا گیا"، جن کی تعداد اس وقت چار سو سے زیادہ تھی[11]۔قرآن کی آیتوں نے ہی اس گروپ کو تصوف کے طریقے پر چلنے کے لئے راغب کیا، جو اس طرح ہے۔

و مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ: (سورہ الزیارات، الایۃ 56)

ترجمہ: اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

فَاذْکُرُو اللّٰہَ قِیَاماً وَّ قُعودًا و عَلٰی جُنُوبِکُمْ
ترجمہ: بس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر وقت) یاد کرو۔

نیک بندوں (اچھے لوگوں) کی پہچان کے سلسلے میں قرآن میں مذکور ہے کہ وہ لوگ ہیں:۔

یَذکُرونَ اللّٰہ قیاماً و قعودًا و عَلٰی جُنوبِھِمْ
ترجمہ: جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے رہتے ہیں

تَتَجافٰی جُنوبُھم عَنِ الْمَضاجِعِ یُدْعُونَ فَاوُطَمعا (الآیت 17)
ترجمہ: جو رات میں نیند سے اٹھ کر خوف اور امیدوں کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

تَراھُم رُکّعاً سُجّداً یَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللّٰہِ وَ رِضْوانًا (سورۃ فتح، الآیت 29)
ترجمہ: تم ان کو دیکھو گے کہ خدا کی مہربانی اور خوشنودی کے لئے رکوع اور سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں۔

اِنّ رَبّکَ یَعْلَمُ اَنّکَ تَقُومُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ اللّیلِ و نِصْفَہٗ و ثُلُثَہٗ و طائفۃٌ مّنَ الّذین مَعَك۔ (المزمل، الآیت 40)

ترجمہ: یقیناً تیرا رب جانتا ہے کہ تو آدھی رات کو اٹھتا ہے اور آخر رات کو اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے[12]۔

صوفیا کا یہ یقین کہ بندہ اپنی ریاضت اور خدا سے محبت کرنے کے سبب، خدا کا قرب تو اسے مل جاتا ہے لیکن معرفت یعنی خدا اور بندوں کے درمیان ایک کڑی بھی بن جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مجدّد الف ثانی نے قرآن کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے۔

اُدْعونِي اَسْتَجِبْ لَکُم (سورۃ مؤمن، الآیت 60)
ترجمہ: تم مجھے پکارو، میں تم کو جواب دوں گا۔

وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

ترجمہ: اللہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں کہیں تم ہو، جو کچھ تم کرتے ہو وہ دیکھتا ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَا تُبْصِرُوْنَ (سورۃ الواقعہ، الآیت 85)

ترجمہ: ہم تمہارے بہت قریب رہتے ہیں، لیکن تم نہیں دیکھتے۔

وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورہ کہف الآیت 16)

ترجمہ: جو تمہارے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہیں اور تمہارے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے ہم سب جانتے ہیں [13]۔

شیخ ابو نصر السراج نے اپنی کتاب "کتاب اللمعۃ" میں لکھا ہے کہ قرآن میں صادقین، صادقات، مخلصین، محسنین، خائفین، عابدین، اولیاء، ابرار، مقربین وغیرہ جو الفاظ مختلف جگہوں پر استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ سبھی تصوف سے متعلق ہیں [14]۔

قرآن میں اللہ نے نبی حضرت محمد ﷺ پر جو پیغام نازل کیا ہے، وہ اس طرح ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ط

(المزمل الآیت ۱۔۸)

ترجمہ: اے کملی اوڑھنے والے بیچ رات میں اٹھ کر نماز پڑھ، اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھ۔ ہم تمہارے پاس ایک پیغام بھیجنے والے ہیں۔ رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا ایک مشکل کام ہے۔ تیرے لئے دن میں بہت سے کام ہیں۔ اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے ہٹ کر اسی کی طرف ہو جا [15]۔

صوفیاء کی نظر میں تصوف

صوفیاء کا کہنا ہے کہ ہر چیز سے ہٹ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جانے کا پیغام اللہ نے جو پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو دیا ہے۔ اس پیغام پر ہم صوفی عمل پیراں ہوتے ہیں۔ پورے دن لوگوں

میں بیٹھ کر اسلام کی تعلیم دینا اور کچھ وقت نکال کر نیز آدھی رات میں اٹھ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو جانا صوفیاء کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تحریر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اس حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ یقینی طور سے تصوف کا مفہوم اس حدیث سے آیا ہے جو اس طرح ہے 'اللہ کے فرشتے جبرئیل نے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ سے کہا کہ احسان کے سلسلے میں آپ کیا سمجھتے ہیں، بتائیں؟ تو پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے کہا کہ:

الاِحْسانُ اَنْ تَعبُدُ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَراہُ فَاِنْ لَم تَکُنْ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (البخاری)

ترجمہ: اللہ کی عبادت اس طرح سے یعنی یہ سمجھ کر کرنی چاہئے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تمہیں یقیناً دیکھ رہا ہے[16]۔

تصوف کا اصل پیغام یہی ہے کہ وہ اپنی عبادت کے وقت یہ خیال کرے کہ وہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، اس سے مخاطب ہے۔ اگر اس کی اندرونی صلاحیت اسے نہیں دیکھ سکتی ہے تو وہ یعنی خدا اسے یقیناً ہی دیکھ رہا ہے۔ اب رہا ذکر، مجاہدہ اور ریاضت کا، تو یہ سبھی کام نفس کو پاکیزہ بنانے کے لئے لازمی ہے۔ بغیر تزکیۂ نفس کے ایک آدمی اپنے اندر کے وسوسے سے نجات نہیں حاصل کر سکتا ہے۔ وہ لالچ، چوری، حسد اور بے اطمینانی جیسی باتوں سے نجات نہیں پا سکتا ہے۔ نفس امارہ پر قابو پانے کے لئے تزکیۂ نفس کا ہونا لازمی ہے بغیر اس کے اللہ کی خوشنودی اور اس کی قربت حاصل نہیں کی جا سکتی ہے۔ تزکیۂ نفس کے تعلق سے قرآن میں مذکور ہے کہ:۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا و قد خَابَ مَنْ دسّٰھا (سورہ الشمس الآیت 10)

ترجمہ: بیشک نفس کو جس نے صاف کیا یعنی باطن کو پاکیزہ کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اسے گندہ کیا نا کام رہا۔

یَومَ لا یَنفَعُ مَالٌ و لا بَنُونَ اِلّا مَن اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (سورہ الشعرا ،الآیت 88-87

ترجمہ: اس سلسلے میں دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ ''اس دن یعنی قیامت کے دن مال و دولت اور اولاد کام

نہیں آئیں گے لیکن جو آدمی سچے دل کے ساتھ حاضر ہوگا وہی کامیاب ہوگا۔

درحقیقت تصوف کی حقیقت اور اس کا تعلق قرآن اور حدیث نیز پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے طرزِ عمل سے ہے اور یہ بالکل اسلامی ہے۔ لیکن جیسے جیسے تصوف کا فروغ ہوتا گیا اس کا ربط مختلف سماج، تہذیب اور مذہبوں سے ہوتا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اسکی اصل شکل میں تبدیلی دکھائی دینے لگی۔ ایسا ہونا فطری تھا۔ جب ہندوستان میں تصوف متعارف ہوا تو صوفیاء نے یہاں کی سماجی اور تہذیبی صورت حال سے خود کو جوڑ کر ہندوستانی معاشرے کو اپنے قریب کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح کے طریقے اپنا کر انہوں نے اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل کی۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ ہندوستان میں متعارف ہونے والا تصوف مکمل اسلامی نہیں رہا۔ بلکہ اس میں ہندوستانی سماج کے رسم ورواج شامل ہو گئے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صوفیاء کو علاقائی سماجی رسم ورواج کے ساتھ اسلام مذہب کا تعارف اور اس کی ترویج کرنا قرآن وحدیث کی رُو سے مناسب تھا؟ اس سلسلے میں قرآن میں مذکور ہے کہ

وَ اُنزِلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (...)

ترجمہ: اور اللہ نے تم پر قرآن اتارا اور حکمت نازل کی یعنی ایسی حکمت بتائی جو اس سے پہلے ان ساری باتوں کا تمہیں علم نہیں تھا[17]۔

صوفیاء کا کہنا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن یعنی خدا کے پیغام کو اپنی حکمت یعنی عقل اور کردار سے لوگوں کو بتایا، سمجھایا اور ان کی روح میں وہ ساری باتیں حکمت سے اتار دی۔ تصوف میں بھی یہی حکمت اپنائی گئی۔ قرآن اور حدیث کی باتوں کو صوفیاء نے اپنی حکمت سے بتانے و سمجھانے اور لوگوں کے دل میں اتارنے کی کوشش کی اور اس حکمت عملی کو اپنا کر اسلام کا پیغام ہر فرد تک پہنچانے میں کامیاب بھی رہے۔

صوفیاء کا کہنا ہے کہ پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی پوری زندگی اتنی صاف ستھری اور معیاری تھی کہ ان کے پاکیزہ اخلاق اور عمدہ سلوک کی وجہ سے ہی انہیں عرب جیسے سخت معاشرے میں اسلام کے پیغام کو پھیلانے میں کامیابی حاصل ہو سکی۔ اسی وجہ سے، پاکیزہ سلوک اور عمدہ اخلاق کو تصوف میں بنیادی طور سے اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔

حوالہ جات

1. خلیق احمد نظامی، Some aspect of religous and politics in India during the thirteen century, Delhi.(1974) صفحہ نمبر 51
2. ایضاً،صفحہ نمبر 50
3. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، جلد 1، دہلی، (1980)، صفحہ نمبر 49
4. ایضاً،صفحہ نمبر 46
5. ایضاً،
6. ایضاً،صفحہ نمبر 46,47
7. ایضاً،صفحہ نمبر 40
8. ایضاً،صفحہ نمبر 41
9. ایضاً،صفحہ نمبر 42
10. ایضاً،صفحہ نمبر 51
11. ایضاً،صفحہ نمبر 57
12. ایضاً،صفحہ نمبر 52-53
13. ایضاً،صفحہ نمبر 53
14. ایضاً،صفحہ نمبر 53-54
15. ایضاً،صفحہ نمبر 54
16. ایضاً،صفحہ نمبر 54-55
17. ایضاً،صفحہ نمبر 51

☆☆☆

دوسرا باب

صوفی تحریک اور اس کا ارتقاء

تصوف کی ابتدا اور صوفی تحریک کا تاریخی پس منظر

تصوف کی ابتدا اور صوفی تحریک اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے عرب کے اسلامی معاشرہ اور سیاست کے بدلتے ہوئے تاریخی منظرناموں کا مطالعہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسی بدلتے ہوئے منظرنامہ، خلافت اور ملوکیت کے بدلتے ہوئے نظریہ سے تصوف کی ابتدا اور صوفی تحریک کا آغاز ہوا۔

حضرت محمدؐ کا آخری پیغام 'حجتہ الوداع'

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے اسلام کے تمام احکامات پر عمل کر کے واضح طور پر یہ بتا دیا کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایک مسلمان کو اپنی ذاتی، سماجی اور سیاسی زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیے؟ زندگی کے آخری ایام میں 'حجتہ الوداع' کے موقع پر ایک آخری خطبہ دیا اور کہا کہ "اے مسلمانوں، ہماری ان باتوں کو غور سے سنو اور اس پر تاعمر پوری پختگی سے عمل کرتے رہنا، ورنہ بھٹک جاؤ گے"، "آج اسلام مکمل ہو گیا۔ اب اس کی تکمیل میں کسی بھی شے کی کمی نہیں رہ گئی ہے۔" اور کہا "کچھ باتیں اہم ہیں، جو بتا دینا چاہتا ہوں"، جو اس طرح ہیں:

- ''بداعتقادی کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اب مہذب اور منظم دور سے تم گزر رہے ہو۔ جس طرح تم اس مقدس مقام 'مدینہ' کا اور 'ماہِ رمضان' کا احترام کرتے ہو، اسی طرح اپنے ایک مسلمان بھائی کی عزت کرتے رہنا۔ مسلمان کا خون، دولت اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام کا حساب لے گا۔ دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہونا، یعنی بھٹک نہ جانا۔''

- ''دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنا، اپنی بیوی پر تمہارا جتنا حق ہے، اتنا ہی حق تمہاری بیوی کا تمہارے اوپر ہے۔ اس کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اور اللہ سے ڈر کر ان کے حقوق کا خیال رکھنا۔ اپنے غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، ان سے سختی سے مت پیش آنا۔ جو کھانا کھانا انھیں بھی وہی کھلانا۔ جو پہننا، انھیں بھی وہی پہنانا۔ وہ بھی تمہاری طرح اللہ کے بندے ہیں۔''

- ''کسی بھی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے، نہ ہی کسی عجمی کو کسی عربی پر بالادستی حاصل ہے، بلکہ سبھی آدم کی اولاد ہیں اور سبھی برابر ہیں۔''

- ''تمہارے کسی بھائی کی کوئی بھی چیز تمہارے لیے حلال نہیں ہے، جب تک کہ وہ اس کی اجازت نہ دیدے۔ دیکھو، ناانصافی مت کرنا۔''

- ''میں نے تمہارے لیے ایک ایسی رہنما چیز چھوڑی ہے، جسے مضبوطی سے پکڑے رہنا، ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ یاد رکھو وہ 'قرآن' اور میری 'سنت' یعنی میری عملی زندگی ہے۔''

- ''اپنے برتاؤ میں شفافیت، مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی اور آپسی تعلقات، یہ تین ایسی باتیں ہیں، جو سینے کو پاک رکھتی ہیں۔''

- ''کسی بھی خاندان کو کسی نسل پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ بداعتقادی کا دور ختم ہو چکا۔ دیکھو نسلی امتیاز کے نام پر کبھی آپس میں جھگڑا مت کرنا[1]۔''

درج بالا باتیں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے آخری خطبہ سے ماخوذ ہیں، جو مسلمانوں تک آخری پیغام کی شکل میں پہنچائی گئیں۔

پیغمبر اسلام کے ان احکامات پر چاروں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی نے پوری تندہی سے پیروی کی، اور اسی کی روشنی میں اپنی تمام سرگرمیوں کو جاری وساری کرنے کی کوشش کی۔ ان خلفائے راشدین نے اپنی ذاتی، سماجی و سیاسی زندگی سے وابستہ تمام سرگرمیوں کو اسلام کے انہی احکام پر انجام دیا۔

عرب کا سیاسی پس منظر

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے جمہوریت کی بنیاد پر خلافت قائم کی۔ اپنی زندگی میں ہی حضرت ابوبکر صدیق کو مسجد نبوی کا امام مقرر کیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات اور قبائل سے اہل علم حضرات کا انتخاب کر کے 'مجلس شوریٰ' کی تشکیل کی گئی، جو خلیفہ کی تقرری کیا کرتی تھی، لیکن چوتھے خلیفہ حضرت علی کی وفات کے بعد یہ جمہوری نظام ناکارہ ہو گیا اور خلافت راشدہ کے بعد جو سیاسی نظام قائم ہوا، وہ پیغمبر اسلام کے احکام کے مطابق نہیں تھا[2]۔ دورِ امیہ میں اسلام کی سیاسی شکل کا مرکزی نقطہ ہی بدل گیا۔ اب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور یہیں سے خلافت میں بادشاہت (ملوکیت) کے تصور کا آغاز ہوتا ہے۔ اب جمہوری، صاف وشفاف اور بہتر پالیسیوں کی جگہ پر تخت اور تاناشاہی نظام حکومت پر توجہ دی جانے لگی۔ عوام کا رشتہ جو خلفائے راشدین کے دور میں تھا، اس کی خصوصیات اب ختم ہونے لگیں۔ اب خلیفہ یا سلطان سے ملنا مشکل ہو گیا، دروازے پر چوکیدار یا دربان بٹھائے جانے لگے۔ عوام سے حاصل کی گئی دولت، یعنی بیت المال کو اب اپنی ملکیت تصور کیا جانے لگا۔ اب خلیفہ کے رتبہ کو بلند کرنے کے لیے تخت اور اس کے لیے بڑی اور عالیشان عمارتیں بنائی جانے لگیں۔ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم وتربیت کے فروغ کی جانب توجہ کم ہونے لگی، جو اس سے قبل کے خلیفہ کی پہلی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔ پیغمبر اسلام اور چاروں خلفاء کے جو سماجی، مذہبی اور سیاسی برتاؤ کی مجموعی شکل تھی، وہ سماجی زندگی میں اب صرف ایک شاندار ماضی بن کر رہ گیا۔ اسلام کی مجموعی شبیہ اب ختم ہو گئی۔ سیاست کو مذہب سے الگ سمجھا جانے لگا، جب کہ مسلمانوں کی ساری زندگی چاہے وہ معاشی ہو یا معاشرتی یا پھر سیاسی، ان سب کا محور پہلے اسلام ہی ہوا کرتا تھا۔

پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ اور خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان

غنی اور حضرت علی نے جس طرح اپنی عملی زندگی سے اسلام کے انسانیت اور محبت کے پیغام کو پیش کیا، وہ بلا شبہ پوری انسانیت کے لیے ایک نعمت ثابت ہوئی، اور بخوشی لوگ اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے، لیکن ان چاروں خلفائے راشدین کے بعد خلافت کی جو روایت شروع ہوئی اس نے جنگ اور سلطنت اور سلطنت کی فتح اور اس کی وسعت کو اپنا مقصد بنا لیا۔ اسلام کو پھیلانے کا جوش دلا کر وسطی ایشیا کی ریاستوں کو فتح کرنا ان خلفاء کا نصب العین بن گیا۔ سلطنت اور فتوحات نے انھیں اندھا بنا دیا۔ وہ پیغمبر اسلام کے ذریعے دیے گئے پیغامات اور اسلام کے مقدس اصولوں کو بھی بھول گئے۔ سنت رسول پر قائم رہنے والے مسلمانوں کو اس وقت زبردست دھکہ لگا جب تخت اور خلافت کے لیے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے نواسے اور فاطمہ زہرا کے نور چشم حضرت امام حسین کو کربلا کے میدان میں شہید کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے ان مسلمانوں کو، جو سنت رسول پر عمل پیراں تھے، اور جو اپنی زندگی انہی اصولوں پر گزارنا چاہتے تھے، ان کو خلافت اور سیاسی مشغلوں سے نفرت ہونے لگی، اور وہ سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے بالکل الگ ایک خالص دین کی دنیا بسانے کے بارے میں سوچنے لگے، جس میں سیاست کا کہیں بھی عمل و دخل نہ ہو، اس کی ناپاکی نہ ہو بلکہ پوری ایمانداری سے صرف نبی کی عملی زندگی کی پیروی کی جائے۔ خلافت کے نام پر اتنے فسادات برپا کیے گئے کہ ان سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے میں خود کو ان سے محفوظ رکھنا ہی سب سے بڑا مجاہدہ تھا۔ کربلا کی جنگ کے بعد ہر فرد، ہر فرقہ اس سے کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوا، اور انہی حالات کی بنیاد پر ایک ایسا گروہ وجود میں آیا، جس نے صحیح معنوں میں نبی کے احکامات پر قائم رہنے کے لیے، اس گندے معاشرہ سے علاحدگی اختیار کر کے، خدا کی عبادت کے لیے شہر چھوڑ کر پہاڑوں کے دامن میں پناہ لے لیا، یعنی اس سیاسی اور نفاقی سماج سے باہر نکل کر ہجرت کر لینے کو زیادہ مناسب سمجھا۔

صوفیاء کا پہلا گروہ (661ء سے 850ء تک)

بصرہ اور کوفہ شہر جہاں اموی گورنروں نے مظالم کے پہاڑ ڈھائے تھے، یہیں تصوف کا پہلا مرکز بنا، اور یہیں سے یہ تحریک دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اس پہلے گروہ کا عہد 661ء سے 850ء تک مانا جاتا ہے، جس کے سرکردہ رہنماؤں کے نام ہیں:

1. اویس قرنی
2. حسن بصری
3. مالک دینار
4. محمد واسع
5. حبیب اعظمی
6. خواجہ فضیل بن ایاز
7. ابراہیم بن ادہم

اس گروہ میں عالم اسلام کی مشہور شخصیات شامل تھیں، جن کا تعارف دنیا کے لیے قابل محتاج نہیں۔ ان بزرگوں کا ذکر فریدالدین عطار کی تصنیف 'تذکرۃ الاولیاء' میں موجود ہے[3]۔

ان صوفیائے کرام نے نبی کے احکامات کو اپنی زندگی میں اتار کر، اس پر سختی سے عمل کیا۔ ان بزرگوں کی زندگی اس وقت عملی طور پر مجموعی نہیں تھی، انھوں نے اپنے مریدوں کا کوئی گروہ پیدا نہیں کیا، اور نہ ہی عبادت کے کوئی الگ طریقے اپنائے۔ انھوں نے صرف سلطنت سے علاحدگی اختیار کر کے اپنی ساری زندگی عبادت وریاضت میں صرف کر دی۔ اگر عصر حاضر کا کوئی خلیفہ یا کوئی عہدیدار اُن سے ملاقات کے لیے آتا تھا، تو وہ ان سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر ان سے ملاقات ہو جاتی تو پوری ہمت کے ساتھ ان کی خامیوں کا ذکر ان کے سامنے ہی کر دیتے۔ اس طرح کی ہمت اس وقت کسی اور فرد میں نہیں تھی کہ وہ خلیفہ کی برائی اور اس کے خلاف ایک لفظ بھی، اس کے سامنے کہہ سکے۔ اگر کوئی شخص ایسی ہمت کرتا تو اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ لیکن یہ بزرگ حضرات ان باتوں سے خوف نہیں کھاتے تھے[4]۔

امام ابوحنیفہ، ابوسفیان ثوری، خواجہ فضیل بن ایاز، خواجہ حبیب اعظمی، ابراہیم بن ادہم وغیرہ ایسے بزرگ تھے، جنھوں نے اس عہد کے خلیفہ کے ذریعے کیے گئے غیر اسلامی کاموں کو یہ ثابت کر دیا کہ انہی ساری خرافاتوں کے سبب انھیں معاشرہ سے الگ ہونا پڑا ہے، اور اپنے بہتر اور پاک وصاف سلوک سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ حق تو حق ہے جو ظلم و بربریت سے خوف نہیں کھاتا ہے، اور نہ ہمیں تم سے کسی قسم کا خوف و ڈر ہے۔ اور اپنی حق پرستی کے حوصلہ سے خلیفہ کے ذریعے کیے جارہے غیر انسانی کاموں کو روکنے کی کوشش کی [5]۔'' ان بزرگوں کا جو کارنامہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اگر تاریخ اسلام سے ان بزرگوں کو نکال دیا جائے تو اسلام کی تاریخ پیغمبر اسلام اور چاروں خلفائے راشدین کی تاریخ کو چھوڑ کر کوئی اور قابل تعریف وتشریح نہیں بن سکتی۔

صوفیاء کا دوسرا گروہ (آٹھویں اور نویں صدی عیسوی)

تاریخ اسلام کے پہلے دور کا سب سے اہم واقعہ خلافت کو ملوکیت میں تبدیل ہونا تھا۔ صوفیائے کرام کا دوسرا گروہ اسی دور سے گزر رہا تھا جس دور میں یونان کے فلسفہ نے اسلام اور قرآن کے احکامات میں شک وشبہ پیدا کرنا شروع کر دیا [6]۔

یونانی فلسفہ سے مسلمان سب سے پہلے مصر کی فتح کے بعد روشناس ہوئے۔ اسکندریہ یونانی فلسفہ کی تعلیم کا مرکز تھا۔ بنی امیہ کے دور میں صرف علم کیمیا (Chemistry) کے مطالعہ کی طرف ہی توجہ دی گئی اور سائنس کے اس موضوع پر مبنی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا [7]۔ لیکن خلافت عباسیہ کے قیام کے بعد، یونانی کتابوں سے مسلمانوں کا رشتہ مزید مضبوط ہوتا چلا گیا۔ خلیفہ ہارون رشید کے دور میں ایک ایسی تنظیم کی بنیاد پڑی جس کا بنیادی کام دیگر زبانوں کی کتابوں کو عربی زبان میں ترجمہ کرنا تھا۔ یونانی فلسفیوں کی تصانیف کے تراجم خلیفہ مامون رشید کے دور میں شروع ہوئے۔ ارسطو اور دیگر فلسفیوں کی کتابوں کا ترجمہ جب عربی زبان میں ہوا تو ان کے مطالعوں نے اسلام کے اصولوں اور عقائد کو مشتبہ بنا دیا اور خلیفہ مامون رشید کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اسلام بداعتقادی اور لغویات کی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ اس نے یہ حکم جاری کر دیا کہ اسلام بداعتقادی کی ترغیب دے رہا ہے، یعنی لوگ قرآن پر اعتماد کرنا چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ان کے پاؤں میں زنجیر باندھ کر بغداد بھیج دیا جائے گا [8]۔

خلیفہ مامون رشید کی منطقی ذہنیت اور اقتصادی ترقی جیسی مدلل انسانی زندگی کے ڈھانچے کو قائم کرنے کے نظریات نے موت کے بعد کی زندگی اور فرشتوں، تقدیروں، عذاب قبر جیسے اسلامی نظریہ کو مشتبہ بنا دیا، جس کا گہرا اثر مسلمانوں پر بھی پڑا۔ خلیفہ مامون کی اس سوچ اور قرآن میں عقیدہ رکھنے والوں کو سزا دینے کے حکم نے مسلمانوں کو نہایت خوفزدہ کر دیا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں نے صوفیاء کا دامن پکڑ لینے میں ہی اپنی عافیت اور بھلائی سمجھی[9]۔

امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح کو قرآن پر پختہ اعتقاد رکھنے کا اعلان کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا، لیکن انھیں سزا دے کر جلد ہی چھوڑ بھی دیا گیا[10]۔

اس عہد کے مشہور صوفی تھے:

1. بایزید بسطامی
2. ذوالنون مصری
3. جنید بغدادی
4. امام احمد بن حنبل
5. محمد بن نوح

ان لوگوں نے منطق، عقل و دلیل اور اقتصادی ترقی جیسے خیالات کی جم کر مخالفت کی۔ صوفیاء نے اپنی روحانی اصلاح، اپنے رب سے محبت اور اس کے سامنے خود کو سپرد کر دینے کو ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنایا اور لوگوں کو بھی یہی سبق دیا۔ انسان کی عقل محدود اور بے بنیاد ہے جو ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہے۔ جس شے کو ہم 20 برسوں تک بہتر سمجھتے رہے، 20 سال بعد وہی شے ہمیں معمولی اور بیکار لگنے لگتی ہے۔ اگر عقل ہی سب سے کارآمد ہے تو جب وہ کسی چیز کو اپنی کسوٹی پر صحیح اور مناسب سمجھتی ہے، تو اسے اس چیز کو ہمیشہ بہتر ہی سمجھنا چاہیے[11]۔ اس طرح صوفیاء نے اپنی روحانی اصلاح اور خدا کے سامنے خود سپردگی کے احساس کو بیدار کر کے، اسلام کی 'وحدانیت' کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اسی دور میں جنید بغدادی نے 'وحدۃ الوجود' یعنی ہر ذرہ میں خدا کا جلوہ ہے، جیسے نظریہ کو فروغ دیا[12]۔

دسویں صدی عیسوی میں تصوف

اسلامی فتوحات کا سلسلہ جب دراز ہوتا چلا گیا تو اس کی وجہ سے نئے نئے علاقائی مسائل بھی سامنے آنے لگے۔ حدیث اور قرآن میں جن مسائل کا حل موجود نہیں تھا، قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے حل کی تلاش کے لیے فقہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس کے قیام کے لیے فقہ کے چار مراکز قائم کیے گئے:

1. امام ابوحنیفہ کا فقہی مرکز (699-766ء)
2. امام مالک کا فقہی مرکز (715-795ء)
3. امام شافعی کا فقہی مرکز (767-820ء)
4. امام احمد بن حنبل کا فقہی مرکز (780-855ء)

فقہ کے ان چاروں مراکز نے اسلامی معاشرے کی ضروریات و مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اور ان کی کوششیں بارآور بھی ثابت ہوئیں۔ اس دور کے حکمراں اور علماء نے اسے قبول بھی کیا، اور انہی اسلامی فقہ کو مسلمانوں کے شرعی مسائل کو سلجھانے میں استعمال بھی کیا جانے لگا، لیکن ایک بہت بڑی مشکل یہ پیدا ہوگئی کہ ہر حکمراں طبقہ اسلامی شریعت کی پکڑ سے بچنے کے لیے ان چاروں اماموں کے فقہ میں سے کوئی نہ کوئی فقہ ڈھونڈ کر خود کو نکال لے یعنی اپنے بچنے کا راستہ نکال ہی لیتا تھا اور قرآن و حدیث کے بنیادی اصولوں اور احکامات پر کوئی دھیان نہیں دیا جاتا تھا[13]۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس حالت کا بیان اپنی تصنیف 'تذکرہ' میں کیا ہے کہ "اب کیا تھا؟ فقہ کے نام پر ہر ذی شعور نے تیزی دکھائی اور ہر خواب پورا ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اب مذہب اسلام میں صداقت و حق کی جگہ پر دھوکہ دہی اور مظالم کے راستے کھل گئے۔ عورتوں کے ساتھ غلط تعلقات جیسے متعدد واقعات کو درست ٹھہرانے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر، 'نکاحِ شرعی' بنا دیا جاتا تھا۔ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت بیوی کے نام کی گئی۔ اسی طرح شریعت کی آڑ میں غیر شرعی کام ہونے لگے[14]۔"

دسویں صدی کے مشہور صوفیاء

1. شیخ ابوسعید ابن عربی (895ء)
2. شیخ ابومحمد الخلدی (952ء)
3. شیخ ابونصر السراج (988ء)
4. شیخ ابوطالب مکی (994ء)
5. شیخ ابوبکر (1000ء)
6. شیخ ابوعبدالرحمٰن السومی (1021ء)

ان بزرگوں نے اجتماعی طور پر ادب کے ذریعے ان مذہبی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی اور یہ پیغام دیا کہ "جب تک دل کی دنیا پاک نہیں ہوگی، انسان کی زندگی میں کیف پیدا نہیں ہوگا، یعنی کسی بھی حالت میں انسانیت کا فروغ تب تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کی روح غلطیوں سے پاک نہ ہو جائے۔ اس کے لیے خدا کی جانب مائل ہونا پڑے گا، یعنی اللہ سے لو لگانی ہوگی اور انسانی کردار و برتاؤ کی سطح کو بلند کرنا ہوگا۔[15]

صوفیاء کے درمیان اخلاق سے متعلق جو نظریہ موجود تھا اس کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے 'شعرالعجم' جلد پنجم میں لکھا ہے کہ "شریعت اور اخلاق کے تحت جن باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ہیں: صبر، رضا، توکل، استغفار، استغنا، قناعت وغیرہ۔ آدمی ان باتوں پر عمل اس لیے نہیں کرتا ہے کہ شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے اس کی پیروی کرنے سے جنت ملے گی، بلکہ ایک صوفی دل پر جبر کر کے صبر اختیار کرتا ہے۔ آدمی نماز اس لیے نہیں پڑھتا کہ اس کو نہ پڑھنے سے دوزخ میں جانا پڑے گا، بلکہ اس لیے پڑھتا ہے کہ اسے چھوڑنا اس کے اختیار میں نہیں، یہ تصوف کا عملی حصہ ہے۔[16]"

دسویں صدی عیسوی میں صوفیاء نے اسلامی ادب کی تخلیق بھی شروع کر دی اور لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ تصوف کیا ہے؟ صوفیوں کا مقصد کیا ہے؟ انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی کہ تصوف روح کی اصلاح، خدا سے محبت اور حسن سلوک کو زندگی میں اتارنے کی ترغیب دیتا ہے، جو ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کی عملی زندگی تھی، اسی کو اپنی زندگی میں

اتارنا صوفیاء کا نصب العین ہے۔

شیخ ابوسعید ابن عربی نے 'طبقات' نامی کتاب لکھی اور اس میں تمام صوفیاء کرام کے کاموں کا ذکر کیا گیا۔ شیخ ابو محمد الخلدی کی 'حکایت الاولیاء' بھی اسی عہد میں تصنیف کی گئی۔ شیخ عبداللہ انصاری نے 'طبقاتِ صوفیاء' کی تخلیق کی۔ مولانا جامی نے 'نفحات الانس طبقاتِ صوفیاء' کے توسط سے ایک کتاب تحریر کی۔ شیخ ابو طالب قرآن وحدیث کے جید عالم تھے، انھوں نے 'قوۃ القلوب' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تصوف نے بنیادی طور پر قرآن وحدیث سے جنم لیا ہے۔ اس کتاب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عبادت کے باطنی پہلو کا مقصد کیا ہے؟

شیخ ابوبکر نے 'التعارف المذہب اہل التصوف' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں اسلام کے ہر ایک اصول کی تفصیل بیان کی اور یہ بتایا کہ یہی صوفیوں کا ایمان اور سلوک تھا۔ اس کتاب میں تصوف کی تعریف نہایت واضح ثبوت کی بنیاد پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس عہد کی سب سے مشہور تصنیف شیخ ابونصر السراج کی کتاب 'کتاب اللمع' ہے۔ اس میں تصوف کی بنیادی باتوں اور علوم کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ نیت کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ 'نیت خدا کے ساتھ ہے اور خدا سے ہے اور خدا کے لیے ہے [17]۔''

دسویں صدی عیسوی میں تصوف نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسی دور میں مستند کتابوں کی تخلیق کی گئی۔ تصوف اس زمانے میں ایک گروہ کی شکل اختیار کر چکا تھا، لیکن یہ تینوں ابھی اپنے ابتدائی دور میں تھے۔ کتابیں رسائل کی شکل میں تھیں۔ ان رسالوں میں صوفیاء کرام کی حالت کا ذکر کیا گیا تھا یا کسی خاص موضوع پر وضاحت کی گئی تھی۔ تصوف کی مکمل تعبیر وتشریح ابھی پوری طرح وجود میں نہیں آئی تھی، تاہم اس کی ابتدا ضرور ہو گئی تھی۔ گروہوں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ پوری طرح منظم نہیں ہوئے تھے، بلکہ تنظیم کی شکل اختیار کر رہے تھے [18]۔

گیارہویں صدی عیسوی میں تصوف

گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور و معروف مشائخ درج ذیل ہیں[19]:

1. شیخ ابونعیم اصبہانی (1038ء)
2. شیخ ابوقاسم قشیری (1072ء)
3. شیخ علی ہجویری (1072ء)
4. شیخ عبداللہ انصاری (1088ء)
5. شیخ ابوسعید ابی الخیر (1049ء)

شیخ ابونعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق اصبہانی حدیث کے علم میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے تھے، جنھوں نے اپنی مشہور تخلیق 'حلیۃ الاولیاء' میں ایک ہزار سے زیادہ صوفیاء کرام کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ کتاب دس جلدوں میں شائع ہوئی، جو صوفیاء کرام کی سوانح اور ان کے تعارف کے لیے ایک مستند اور معتبر کتاب مانی جاتی ہے۔[20]

شیخ ابوالقاسم قشیری اس عہد کے دوسرے سب سے معروف صوفی تھے جنھوں نے قرآن و حدیث کا مطالعہ کرنے کے بعد 'رسالہ فن تصوف' کی تصنیف کی جو بہت مشہور کتاب تصور کی جاتی ہے۔ اس میں تصوف کے مختلف اصولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اپنی اس تخلیق میں انھوں نے صوفیاء اور تصوف کے سلسلے میں جو قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں اور جو الزامات لگائے جا رہے تھے، ان کی تردید حقائق کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی اور یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی کہ "تصوف شریعت یا سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔" ان کی ان دلیلوں اور حقائق نے تصوف کی مخالفت کرنے والے لوگوں کا منہ بند کر دیا۔ اب تصوف کی راہ میں آنے والی رکاوٹیں دور ہو گئیں اور اس کی آگے کی راہ ہموار ہونے لگی۔[21]

شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری ایک مشہور عالم دین اور نہایت ذہین صوفی تھے۔ ان کو مشائخ (صوفیاء) سے ملنے اور ان کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ انھوں نے شام سے لے کر ترکمانستان تک اور ادھر سندھ کے ساحل تک سفر کیا اور آخر میں لاہور آ کر یہیں

سکونت اختیار کر لی۔ ان کی مشہور تصنیف 'کشف المحجوب' ہے جو تصوف کی دنیا میں ایک اعلیٰ پایہ کی کتاب تصور کی جاتی ہے۔ انھوں نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے تصوف کو اسلام اور شریعت سے جوڑنے اور تصوف سے متعلق مشکوک خیالات کو اپنے حقائق کی بنیاد پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ ان کی تصنیف کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس سے قبل جتنی بھی کتابیں تحریر کی گئیں، وہ سب کی سب عربی زبان میں تھیں۔ لیکن انھوں نے پہلی بار اپنی کتاب فارسی زبان میں تحریر کی، جس سے تصوف کو بڑے پیمانے پر عام کرنے کا موقع ملا۔ یہ کتاب آج بھی ہر صوفی کے پاس محفوظ ملے گی۔ اس کی تصنیف سے مشائخ کی آگے کی راہیں ہموار ہو گئیں 22۔

شیخ عبداللہ انصاری ہروی جو 'پیر ہروی' کے نام سے مشہور ہیں، اپنے دور کے مشہور و معروف محدث اور صوفی تھے۔ وہ امام حنبل کے اسکول سے متاثر تھے۔ تصوف کے فروغ میں انھوں نے خاص تعاون پیش کیا۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں 23:

1. منازل السائرین
2. طبقات الصوفیاء
3. کتاب جامع الکلام
4. مناجات

شیخ عبداللہ ہروی کی تخلیقات ہندوستانی صوفیاء کرام کے درمیان زیادہ مشہور ہوئیں۔ شیخ حمیدالدین ناگوری نے اپنے ملفوظات میں جگہ جگہ ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

اس دور میں ادب کی شکل میں تصوف پر مبنی جو کتابیں منظر عام پر آئیں، اس کے دور رس اثرات پڑے اور تصوف کے بارے میں جن مشکوک باتوں کی تشہیر کی گئی تھی، ان کا خاتمہ ہو گیا اور اب ہر نظریہ فکر کے صوفیاء و علماء نے تصوف کے حق میں لکھنا شروع کر دیا۔

بارہویں صدی عیسوی میں تصوف

بارہویں صدی عیسوی کے مشہور مشائخ درج ذیل ہیں:

1. امام غزالی (1111ء)
2. شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی (1166ء)
3. شیخ محی الدین ابن عربی (1165ء سے 1245ء)
4. شیخ شہاب الدین سہروردی (1144ء سے 1234ء)
5. شیخ اکبر (1165ء میں اسپین میں پیدا ہوئے)
6. خواجہ شیخ فریدالدین عطار (1230ء)
7. حکیم سنائی (ہم عصر عظیم صوفی شاعر)

بارہوی صدی عیسوی کا زمانہ امام غزالی (1111ء) کا دور مانا جاتا ہے، جو صوفی دنیا کے مشہور و معروف صوفی ہیں۔ امام غزالی کو تصوف کا مرکزی نقطہ تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے دور میں تصوف کی تبلیغ کے لیے 300 سے زیادہ تربیت یافتہ صوفی تیار کیے تا کہ وہ پوری دنیا میں جا کر تصوف اور اسلام مذہب کی تعلیمات کو عام کرسکیں۔ امام صاحب نے تصوف کی تشریح و توسیع اس طرح کی کہ تصوف کا مطالعہ ایک نصاب کی شکل میں کیا جانے لگا۔ امام غزالی ایک عظیم دانشور تھے جنھوں نے دین اسلام کی تشریح اپنے علم اور حقائق کی بنیاد پر اس طرح کی کہ پورے اسلام کی شکل و صورت ہی تصوف کے اردگرد گردش کرتی محسوس ہونے لگی[24]۔

بارہویں صدی کے دوسرے عظیم اور مشہور صوفی شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی (1166ء) ہیں۔ امام غزالی نے جہاں ایک طرف تصوف کی تشریح کر کے لوگوں کو اس کا مطالعہ ایک نصاب کی شکل میں کرنے پر مجبور کر دیا، تو دوسری جانب شیخ جیلانی نے تصوف اور اس کے نظریات و اصول کو عملی شکل دے کر دنیا کو اس کی راہ پر چلنے کے لیے آمادہ کر دیا[25]۔ ان کی تعریف ضیاء الدین برنی نے 'تاریخ فیروز شاہی' میں کی ہے۔ لکھا ہے کہ ''شیخ جیلانی نے اپنے برتاؤ اور اصول سے اسلامی تصوف میں ہنگامہ برپا کر دیا، جو اپنے آپ میں ایک عدیم المثال کارنامہ تھا[26]۔'' ان کی تعلیمات

نے بودھ مذہب کو زیادہ متاثر کیا۔ افغانستان اور اس کے پڑوسی ممالک میں ایک طرح سے اسلامی انقلاب برپا کر دیا اور ہزاروں لوگوں نے ان کے سلوک سے مذہب اسلام کو قبول کر لیا۔ ان کی مشہور تصانیف 'فتوح الغیب'، 'فتح ربانی' اور 'الفیوضات الربانیہ' ہیں [27]۔

بارہویں صدی کے اخیر میں بھی کئی مشہور صوفی پیدا ہوئے، جنھوں نے تصوف اور اس کی تحریک کو آگے بڑھانے میں نہایت اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان میں سے چند کے نام ہیں، شیخ محی الدین ابن عربی (1165ء سے 1240ء)، شیخ شہاب الدین سہروردی (1144ء سے 1234ء)۔ ان دونوں نے تصوف کی دنیا میں کئی حیران کن کارنامے انجام دیے [28]۔

شیخ اکبر 1165ء میں اسپین میں پیدا ہوئے، جنھوں نے تصوف سے متعلق 500 سے زیادہ کتابیں تحریر کیں، جن میں 150 اب بھی محفوظ ہیں۔ شیخ اکبر نے 'وحدت الوجود' کے نظریہ کی تعبیر اس طرح پیش کی کہ یہ تصوف کی روح بن گئی [29]۔

بارہویں صدی عیسوی نے تصوف کو اجاگر کرنے کے لیے عظیم صوفی شعراء کو جنم دیا، جن میں خواجہ فرید الدین عطار نے صوفیانہ شاعری کی تخلیق کے ذریعے تصوف میں جوش و امنگ بھر دیا۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، رباعی کے ذریعے تصوف کی روح کو اس طرح پیش کرنا شروع کر دیا کہ ان اشعار کو جہاں بھی پڑھا جاتا، وہاں 'وحدت ہی وحدت' کا ماحول پیدا ہونے لگتا [30]۔

نتیجتاً، ہم دیکھتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی میں تصوف ایک نصاب کی شکل میں کمال عروج تک پہنچ گیا۔ امام غزالی، شیخ اکبر، شیخ شہاب الدین سہروردی کی فکر نے تصوف اور صوفی کے فلسفیانہ عناصر کی اس طرح تشہیر کی کہ تصوف کی ترویج و ترقی کی راہ مزید ہموار ہو گئی۔ حکیم سنائی اور خواجہ عطار کے اشعار اس قدر اثر انگیز تھے کہ انھوں نے عشق الٰہی کے جذبات کو پھیلانے میں آگ کی طرح کام کیا۔ اب تصوف کو صرف سماجی انقلاب کی شکل اختیار کرنی باقی رہ گئی تھی جس کی تکمیل تیرہویں صدی عیسوی میں ہوئی [31]۔

تیرہویں صدی عیسوی میں تصوف

تیرہویں صدی عیسوی میں تصوف تنقید کی تمام سرحدیں پار کر کے اپنی بلوغت کے دور میں داخل

ہو گیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں امام غزالی اور شیخ اکبر اور دیگر صوفیاء کرام کی محنت و کاوش اور ان کی ادبی و عملی سرگرمیوں سے، تیرہویں صدی عیسوی میں تصوف اپنے ارتقا کے بام عروج پر پہنچ گیا۔

تصوف کی ابتدا اور اس کی ترقی مسلمانوں کی ان سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر ہوئی، جن سے دین اسلام اور رسول اللہ کی سنت کی اندیکھی ہوئی تھی۔ آخری خلیفہ حضرت علی کے بعد، مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی بالادستی کا زوال شروع ہو گیا جس کا سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی تک چلتا رہا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی سیاسی صورت حال اتنی خراب ہوگئی کہ ان کا انتظامی ڈھانچہ پوری طرح بکھر کر رہ گیا۔ اس دور کا حکمراں خوارزم شاہ جب اپنے 100 افسروں کو حاضر ہونے کا حکم دیتا، تو ان میں صرف 10 ہی اس کے حکموں کی تعمیل کرتے۔ پوری سلطنت میں لوٹ پاٹ کے واقعات عام ہونے لگے۔ انتظامی سرگرمیاں بالکل ناکام ہوگئیں۔ بغداد کا وہ علاقہ، جو تاجروں سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، اب وہاں کبوتر بازوں کے اڈے بن گئے۔[32]

مسلمانوں کے کردار و برتاؤ میں گراوٹ اور ان کے سماجی و سیاسی انتشار کے سبب ہی منگولوں کے حملے ہوئے، اور منگولوں نے پورے بغداد اور مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کو تباہ و برباد کر دیا۔ بغداد، جو اسلامی حکومت کا مرکز تصور کیا جاتا تھا، منگولوں نے وہاں پر اس قدر قتل عام کیا کہ سارے شہر میں خون کا سیلاب دکھائی دینے لگا، دریائے دجلہ مسلمانوں کی لاشوں سے بھر گئی اور میلوں دور تک اس کا پانی خون سے سرخ ہو گیا۔ خانقاہوں اور مدرسوں کو مسمار کر کے ان کی نشانیوں کو مٹا دیا گیا۔ کتب خانوں کو نذر آتش کر کے انھیں خاکستر کر دیا گیا۔ مسلم ممالک پر منگولوں نے اس طرح حملہ کیا اور ان کو اس طرح تباہ و برباد کرنا شروع کیا کہ اس کی کوئی بھی نشانی باقی نہ رہے۔[33]

منگولوں کے حملوں اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری نے مسلمانوں کو اپنے اللہ کی جانب مائل ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنے خدا کی جانب لوٹنے کے لیے بے بس و بے تاب نظر آنے لگے۔ تبع تابعین اب تصوف کی طرف آمادہ ہونے لگے اور شہر چھوڑ کر خدا کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ وہ اب سیاسی اور دنیاوی شان و شوکت کو چھوڑ کر اسلام کے احکامات کو اپنی زندگی میں اتارنے اور ان پر عمل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ نتیجے کے طور پر ان تبع تابعین نے اپنے اسلامی اخلاق اور برتاؤ کو اپنی زندگیوں میں اس طرح اتارا کہ ان کے بہتر اخلاق و کردار اور برتاؤ نے

منگولوں جیسے بربر حملہ آوروں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بھی ایمان لانے لگے اور اسلام کی آغوش میں آ گئے۔ جن منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، انہی کے ذریعے اسلام کی تعمیر بھی ہوئی۔ منگول حملہ کی وجہ سے اسلام کے اندر جو انتشار پیدا ہوا اسے منگولوں نے دوبارہ منظم کرنا شروع کر دیا، جس کے اثر سے کوئی بھی ملک اچھوتا نہ بچا۔ وسطی ایشیا، ایران، افغانستان، ہندوستان اور یورپ کے کئی ممالک منگول حکمرانوں کے زیر اقتدار آ گئے اور اسلام ایک بار پھر منگولوں کے ہاتھوں اپنے بام عروج پر پہنچ گیا[34]۔

نتیجہ کے طور پر جب ہم ان حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہی لوگ، جنھوں نے شہر چھوڑ کر تصوف کی راہ کو اختیار کر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ منگولوں کے قتل و غارت سے بچ گئے تھے، انھوں نے اپنے اخلاق و کردار اور خصلت و عادات سے منگولوں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بھی اپنے غضب ناک برتاؤ کو چھوڑ کر اسلام مذہب میں شامل ہو گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ آٹھویں صدی عیسوی سے اٹھا یہ سوال کہ تصوف کیا ہے؟ ہر صدی عیسوی میں تصوف نے اپنی تعبیر و تشریح پیش کرتے کرتے تیرہویں صدی عیسویں میں آ کر یہ ثابت کر دیا کہ "تصوف خدا کا وہ راستہ ہے جو حقیقی شکل میں مذہب اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنے اور تمام انسانوں کے ساتھ بہتر اخلاق و کردار اور بہتر برتاؤ و سلوک قائم کرنے اور خود کو قرآن کے احکامات پر قائم کرنے کا نام تصوف ہے، اور اسی پر خود کو قائم کرتے والا ہی صوفی ہے۔"

تیرہویں صدی عیسویں میں حالات سے مجبور ہو کر جو عالم تصوف کی طرف مائل ہوئے، ان میں درج ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:

1. مولانا روم
2. شیخ سعدی
3. اوحدی
4. عراقی [35]

صوفی سلسلے

تیرہویں صدی عیسوی کے مشہور شاعروں نے اس طرح کی روحانی شاعری کی تخلیق کی کہ پورا معاشرہ تصوف کے رنگ میں رنگ گیا اور مشائخ (صوفیاء کرام) نے اس طرح کی روحانی تعلیم وتربیت کا نظام شروع کیا کہ کوئی بھی فرد ان کے اثر سے اچھوتا نہیں رہ سکا۔ ولایت کے بارے میں قطب، ابدال وغیرہ کے مسئلے پر جو تنازع چل رہا تھا، منگولوں کے بربر حملوں اور ان کے اثرات نے اسے ختم کردیا اور ان 'تبع تابعین' یعنی صوفیوں کو متحد ہوکر حقیقی معنوں میں مذہب اسلام کو قائم کرنے اور اس کی ترویج وتبلیغ کے کام کرنے کے لیے آمادہ کیا اور ہر مقام پر اسلامی تعلیم وتربیت کے مراکز کھولے گئے۔ اسی تناظر میں کئی سلسلوں کا وجود ہوا: جن میں سے چند اہم کے نام ہیں : خواجگان سلسلہ، قادریہ سلسلہ، چشتیہ سلسلہ، سہروردیہ سلسلہ[36]۔

خواجگان سلسلہ

سلسلوں کی ابتدا میں سب سے پہلے خواجگان سلسلہ وجود میں آیا۔ یہ سلسلہ سب سے پہلے ترکستان میں قائم ہوا۔ اس کے مشہور بزرگ خواجہ محمد عطایسوی (1166ء) تھے۔ ان کے بعد اس سلسلہ کے مشہور خواجہ عبدالخالق غجدوانی (1179ء) تھے، جنھوں نے اس سلسلہ کے فروغ کے لیے کافی کوشش کی، لیکن اس سلسلہ کو شہرت ومقبولیت عطا کرنے کا کام خواجہ بہاء الدین نقشبندی (1388ء) نے کیا، اور انھی بزرگ صوفی کے ساتھ یہ سلسلہ 'نقشبندیہ سلسلہ' کے نام سے جانا جانے لگا۔ کئی نسلوں کے بعد یہ سلسلہ ہندوستان میں 1603ء میں خواجہ باقی باللہ کے توسط سے آیا۔ اس سلسلہ کو خواجہ باقی باللہ کے خلیفہ شیخ احمد مجدد الف ثانی (1624ء) نے، ہندوستان میں خاص طور سے پھیلایا، جن کے نام سے یہ سلسلہ 'مجددیہ سلسلہ' کے نام سے مشہور ہوا[37]۔

قادریہ سلسلہ

اس سلسلہ کی شروعات شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی (1166ء) نے کی تھی، جن کی مزار بغداد میں ہے۔ انھوں نے اپنے دور حیات میں ہی اپنے متعدد مریدوں کو تعلیم وتربیت سے آراستہ وپیراستہ کرکے مختلف اسلامی ممالک میں اپنا خلیفہ (جانشین) بنا کر بھیجا، جس کا عروج روز بروز ہوتا چلا گیا[38]۔ ان کے بڑے فرزند سیدنا سیف الدین عبدالوہاب جیلانی حضرت خواجہ

غریب نواز کے ہمراہ ہندوستان آئے جن کا مزار اقدس دو گاہ بڑے پیر کے نام سے ناگور شریف میں ہے۔

چشتیہ سلسلہ

چشتیہ سلسلہ کی بنیاد شیخ ابو اسحٰق شامی (940ء) نے ڈالی۔ لیکن اسے منظم اور وسیع کرنے کا سہرا خواجہ معین الدین حسن سنجری (1235ء) کے سر جاتا ہے[39]۔

سہروردیہ سلسلہ

اس سلسلہ کے مشہور و معروف صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی (1234ء) ہیں، جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی ایک ایسے تربیتی مرکز کی بنیاد ڈالی جہاں سے متعدد صوفیوں کو تعلیم و تربیت دے کر، مختلف اسلامی ممالک میں کام کرنے کے لیے بھیجا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی نظر خاص طور سے ہندوستان پر تھی۔ انھوں نے مذہب اسلام کی ترویج و تبلیغ کے لیے متعدد تعلیم و تربیت یافتہ صوفیوں کو ہندوستان میں خلیفہ بنا کر بھیجا۔ ان میں شیخ نورالدین مبارک غزنوی، شیخ ضیاء الدین رومی، قاضی حمید الدین ناگوری قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان میں سہروردیہ سلسلہ کو فروغ دینے کا سہرا شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سر جاتا ہے، جنھوں نے ملتان اور اُچ کے علاوہ دیگر علاقوں میں سہروردیہ سلسلہ کی اہم خانقاہیں قائم کیں[40]۔

نقشبندیہ سلسلہ

نقش بندیہ سلسلہ کے بانی حضرت شیخ بہاء الدین نقشبندی (1388ء) ہیں۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ خواجہ باقی باللہ (1603ء) کے توسط سے پہنچا، جن کی درگاہ پرانی دہلی میں صدر بازار سے پہلے عیدگاہ روڈ پر واقع ہے۔ ان کے مشہور خلیفہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (1664ء) اور شیخ عبدالحق دہلوی (1642ء) ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے صاحبزادہ خواجہ محمد معصوم (1668ء) ان کے جانشین ہوئے۔ شیخ احمد سرہندی کے پوتے شیخ سیف الدین (1686ء) سے شہنشاہ اورنگ زیب نے بھی بیعت کی تھی، یعنی ان کے شاگرد بنے تھے۔ حضرت مرزا مظہر

جانِ جاناں شہید (1781ء) کے خلیفہ شاہ غلام علی دہلوی (1824ء) ہیں۔ ان کے ملفوظات 'دارالمعارف' اور 'ملفوظاتِ شریفہ' میں ان نقشبندی بزرگوں کا بیان ملتا ہے۔

شطاریہ سلسلہ

صوفیاء کا ایک سلسلہ ستاریہ ہے، جو ایران میں ہے۔ ایران میں یہ سلسلہ 'عشقیہ' اور روم میں 'بسطامیہ' کہلاتا ہے۔ ''ستار'' کا معنی ہے تیز چلنے والا۔ طریقت کی راہ میں اس قسم کے صوفیاء تیز حرکت کرنے والے ہوتے ہیں، اس لیے یہ سلسلہ شطاریہ سلسلہ' کہلایا۔ ہندوستان میں اس کے بانی شاہ عبداللہ شطاری (1572ء) ہیں۔ یہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے صاحبزادوں میں تھے جنھوں نے بہت لمبا سفر کیا تھا۔ ان کا مزار سعدیہ آباد مانڈو قلع کے اندر خلجی شاہ کے مقبرہ کے قریب ایک چبوترے پر واقع ہے۔ شطاریہ سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ شاہ وجہ الدین علوی (1588ء) احمد آباد میں ہیں۔ دوسرے شیخ محمد غوث گوالیری (1562ء) ہیں جو شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری (1230ء) کے اولادوں میں سے تھے۔ جب شیر شاہ سوری (1539-1545ء) نے ہمایوں بادشاہ (1530-1556ء) کو شکست دی اور ہمایوں ایران چلا گیا، تو شیخ محمد غوث ہجرت کر کے گجرات چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ شیخ عیسیٰ جنداللہ برہان پوری ان کے جانشین بنے۔ شیخ محمد غوث سنسکرت بھی جانتے تھے۔ انھوں نے یوگا پر ایک کتاب 'امرت کنڈ' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں یوگا کا وہ طریقہ بتایا گیا تھا، جس کی ورزش سے اپنے اعصاب پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ریاضت کے لیے یوگا کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ 40 دنوں تک گنگا کے کنارے بیٹھ کر اور چنار کی پہاڑیوں میں گزار کر اس کی ریاضت کی تھی۔ جواہر خمسہ، کلید مخازن، گنج الوحدت، ضمائر اور بصائر وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔

دیگر سلسلے

اس طرح تصوف کے تقریباً چودہ سلسلے قائم ہوئے، جس نے مذہب اسلام کی تبلیغ واشاعت میں کئی حصوں میں کام کیا، ان کے نام درج ذیل ہیں :

1. حبیبیہ، بانی شیخ حبیب عجمی

2. طیفوریہ، بانی شیخ بایزید طیفور بسطامی

3. کرخیہ، بانی خواجہ معروف کرخی

4. سقطیہ، بانی شیخ ابوالحسن سری سقطی

5. جنیدیہ، بانی شیخ جنید بغدادی

6. گازرونیہ، بانی شیخ ابواسحٰق بن شہریار گازرونی

7. طوسیہ، بانی شیخ علاء الدین طوسی

8. فردوسیہ، بانی شیخ نجم الدین کبریٰ

9. سہروردیہ، بانی شیخ نجیب الدین عبدالقادر سہروردی

10. زیدیہ، بانی شیخ عبدالواحد بن زید

11. ایازیہ، بانی شیخ فضیل بن ایاز

12. ادہمیہ، بانی شیخ ابراہیم بن ادہم

13. ہبریہ، بانی خواجہ ہبیر البصری

14. چشتیہ، بانی خواجہ ابواسحٰق شامی

درج بالا سلسلے ہندوستان میں عمل پیرا تھے، جس کا ذکر ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں کیا ہے[41]۔

○❖○

حوالہ جات

1. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، (1953ء)، ص64
2. ایضاً، ص66
3. ایضاً، ص73
4. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، جلد اول، دہلی، (1980ء)، ص73-74
5. ایضاً، ص78-79
6. ایضاً، ص79
7. ایضاً، ص79-80
8. ایضاً، ص81
9. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، (1953ء)، ص81
10. ایضاً
11. ایضاً، ص84
12. ایضاً، ص85
13. ایضاً، ص87
14. ایضاً، ص89
15. ایضاً، ص90
16. ایضاً، ص91
17. ایضاً، ص91-92
18. ایضاً، ص95
19. ایضاً
20. ایضاً، ص97
21. ایضاً
22. ایضاً، ص98
23. ایضاً، ص99-100
24. ایضاً، ص102-105
25. ایضاً، ص107

26. ایضاً،ص108
27. ایضاً،ص109
28. ایضاً،ص110
29. ایضاً،ص111
30. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، (1953ء)، ص123-124
31. ایضاً،ص124
32. ایضاً،ص125
33. ایضاً،ص126
34. ایضاً،ص129
35. ایضاً،ص128
36. ایضاً،ص129
37. ایضاً،ص130-131
38. ایضاً،ص131
39. ایضاً
40. ایضاً،ص131-132
41. خلیق احمد نظامی، Some Aspect of Religion and Politics in India during the 13th Century، دہلی، (1974ء)، ص174۔

○❖○

تیسرا باب

ہندوستان میں صوفی تحریک کا آغاز اور صوفیاء کے کارنامے

ہندوستان میں صوفیاء کی آمد

ہندوستان میں صوفیاء کی آمد کا سلسلہ مسلمانوں کے حملے اور ان کی فتح کے ساتھ ہی شروع ہو گیا۔ خواجہ ابو اسحٰق گازرونی کے مرید شیخ صفی الدین حقانی گازرونی نے بہاولپور، پاکستان میں آ کر مذہب اسلام کی تبلیغ کی۔ ان کی وفات 1007ء میں ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے۔

صوفیاء کی آمد سب سے پہلے سندھ اور ملتان میں ہوئی، اس کے بعد لاہور صوفیاء کا اہم مرکز بنا۔ تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں آنے والے پہلے صوفی شیخ ابو علی السندھی آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ میں آئے (جنرل رضا لائبریری رامپور، جلد-2، 1995ء)۔ اس کے بعد شیخ اسماعیل لاہوری، جو محمود غزنوی کے دور میں 1005ء میں لاہور آئے [1]۔ ان کے آنے کے بعد لاہور میں صوفیاء اور علماء کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی کی ہندوستان پر فتح کی مہم کے دوران ہی شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش نے پنجاب میں آ کر مذہب اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام شروع کر دیا تھا، لیکن کچھ وقت کے بعد انھوں نے لاہور کو اپنا مرکز بنایا۔ جس وقت وہ لاہور آئے اس وقت تصوف اپنے دوسرے دور میں داخل ہو چکا تھا۔ شیخ علی ہجویری (داتا گنج بخش) نے تصوف کے فروغ کے لیے متعدد کتابیں

لکھیں جن میں سے چند کے نام ہیں 'کشف المحجوب'، 'کشف الاسرار' منہاج الدین'۔ یہ کتابیں اس وقت تحریر کی گئیں جب شیخ شہاب الدین سہروردی کی 'عوارف المعارف' اور ابن عربی کی 'فصوص الحکم' ابھی تحریر نہیں کی گئی تھیں۔ تصوف کی دنیا میں ان کی تصنیفات نے اہم رول ادا کیے۔ شیخ داتا گنج بخش کی وفات 1072ء میں ہوئی اور لاہور میں ہی دفن کیے گئے [2]۔

داتا گنج بخش لاہوری کے بعد ہندوستان میں آنے والے مشہور صوفی سلطان سخی سرور ہیں، جن کا نام سید احمد تھا۔ ان کی وفات 1181ء میں ہوئی اور پنجاب کے شاہ کوٹ میں دفن کیے گئے [3]۔

خواجہ معین الدین چشتی (1135-1229ء، اجمیر)

خواجہ معین الدین چشتی سے پہلے ہی ہندوستان میں صوفیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور یہاں پر اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام بھی ملتان، پنجاب اور لاہور میں شروع ہو چکا تھا، لیکن ہندوستان میں پختہ اور منظم طریقے سے کام کرنے کا افتخار خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کو ہی حاصل ہو سکا، جنھوں نے غوری کی فتح کے ساتھ ہی اجمیر میں اپنا کام منظم طریقے سے کرنا شروع کر دیا، اور ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے ہندوستان میں 18ویں صدی عیسوی تک اپنے عروج پر پہنچ کر، ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسلام کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کا کام مکمل کر دیا۔

جس وقت خواجہ معین الدین چشتی نے اجمیر میں آ کر 'دین اسلام' کی تبلیغ شروع کی، اس وقت ہندوستان کی سیاسی وسماجی حالت نہایت ابتر تھی۔ عوام کو اپنے بادشاہ سے کوئی محبت نہیں تھی۔ دولت اور اقتدار کی ہوس میں ایک ریاست دوسری ریاست پر حملہ آور تھی، اور ہر وقت ایک دوسرے کا سرمایہ لوٹنے کے فراق میں رہتے تھے۔ لوٹ پاٹ اور عدم تحفظ کا احساس پورے سماج کے ذہن ودماغ پر غالب تھا۔ چھوا چھوت، ذات پات کا فرق پورے ہندوستانی معاشرے کی شناخت بن چکا تھا۔ انسانیت کا احترام گم ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیر تشریف لائے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے بہتر سلوک اور معجزاتی زندگی، اور دین اسلام کی انسان دوستی، احترام اور مساوات کی تعلیم نے ہندوستانی معاشرے پر جادو کی طرح اثر ڈالا۔ نتیجتاً پورا ہندوستانی معاشرہ جو سماجی نابرابری سے متاثر ہو کر نہایت ابتر حالت میں تھا، اسلام مذہب قبول کرتا چلا گیا۔ اس طرح خواجہ معین الدین چشتی نے غیر انسانی حرکات سے متاثر معاشرے کو

انسانیت پر مبنی باوقار زندگی جینے کا موقع فراہم کیا۔

اتنا ہی نہیں، ان نومسلموں کو اپنی خانقاہ میں تعلیم و تربیت فراہم کرنے کا کام بھی شروع کیا۔ ان کی خانقاہ میں ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ انھوں نے اپنے عام تعلیمی مرکز سے علم فراہم کر کے اسلام کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔

خواجہ اجمیری نے اپنے مریدوں کو اسلام کی تعلیمات سے آشنا کر کے، انھیں اپنا خلیفہ بنا کر، مختلف مقامات پر اس کام کو ایک تحریک کی شکل میں پھیلانے کی کوشش بھی کی۔ ان کے خلفاء میں اہم اور سب سے مشہور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں[4]۔

خواجہ معین الدین چشتی کے خلفاء درج ذیل ہیں :

1. خواجہ قطب الدین بختیار کاکی
2. خواجہ فخر الدین (جو خواجہ معین الدین چشتی کے صاحبزادہ ہیں، جو اجمیر کے قریب سلوار شریف میں دفن ہیں۔)
3. صوفی حمید الدین ناگوری (ناگور، راجستھان)
4. شیخ معین الدین
5. قاضی حمید الدین ناگوری (دہلی)
6. شیخ وجیہ الدین خراسانی (ہرات، خراسان)
7. شیخ برہان الدین عرف بدو (اجمیر)
8. شیخ احمد (اجمیر)
9. شیخ شمس الدین فوغانی (احمد آباد)
10. عبداللہ بیابانی (اجے پال جوگی، اجمیر)
11. شیخ محمد حسن
12. شیخ سلیمان غازی کرشکی
13. شیخ حسن کھیاتی (معین الہند، ص 104-106)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (1111-1235ء، دہلی)

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے سب سے عزیز اور مشہور خلیفہ مانے جاتے ہیں، دہلی میں آکر مقیم ہوئے۔ اس وقت دہلی میں سلطان التمش کی حکومت تھی۔ اپنے برتاؤ اور حسن سلوک سے سلطان کو اس قدر متاثر کیا کہ سلطان التمش ان کا مرید بن گیا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے بھی اسلام مذہب اور تصوف کی تبلیغ و اشاعت کے لیے خاصی جدوجہد کی۔ ساتھ ہی اپنے عزیز شاگردوں کو اسلام کی روحانی اور روایتی خصوصیات سے آراستہ کر کے، اپنا خلیفہ بنا کر مختلف مقامات پر اس کام کے فروغ کے لیے بھیجا۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اہم خلفاء درج ذیل ہیں :

1. شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر (اجودھن)
2. شیخ بدرالدین غزنوی (دہلی)
3. خواجہ امام الدین (بیل گرام)
4. خواجہ محمد سید سگری (بیل گرام)
5. شیخ محمود (نہرولا)
6. شیخ معزالدین (دہلی)
7. شیخ حمیدالدین (نہرولا)
8. شیخ سعد
9. قاضی شیخ عماد (دہلی)

ان تمام خلفاء میں بابا فریدالدین مسعود گنج شکر اور شیخ بدرالدین غزنوی نے اس تحریک کے فروغ میں خاص کارنامہ انجام دیا[5]۔

شیخ بابا فریدالدین مسعود گنج شکر(1173-1265ء، پاک پٹن)

شیخ بابا فریدالدین مسعود گنج شکر اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے مذہبی اور روحانی تعلیم سے آراستہ ہو کر، دہلی چھوڑ کر ہانسی (پنجاب) چلے گئے۔ وہ ہانسی سے دہلی ہمیشہ آیا کرتے تھے۔ دہلی میں رہ کر ولایت کے کام کو صحیح معنوں میں جاری رکھنا انھیں ممکن نہیں لگا کیوں کہ انھوں نے سوچا کہ دہلی میں سلطنت اور اس کی انتظامیہ کا دباؤ خانقاہی نظام پر بنا رہے گا، جو مذہبی کاموں میں خلل پیدا کرے گا، اس لیے انھوں نے ہانسی (پنجاب) میں ہی رہ کر کام کرنا مناسب سمجھا۔

بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کی سوچ بالکل درست تھی۔ سلطان التمش کی موت کے بعد دہلی میں تصوف کا کام ایک طرح سے بند ہو گیا۔ دہلی کے تمام صوفیاء سلطنت سے منسلک ہو گئے۔ علماء، صوفیاء بھی نے سیاست میں حصہ لیا۔ شیخ بدرالدین غزنوی، قاضی منہاج السراج، مولانا نور ترک، شیخ الاسلام سید قطب الدین وغیرہ بے شمار بزرگوں نے دین اسلام کو اپنا مرکزی نقطہ نہ بنا کر، سیاست اور سلطنت کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے[6]۔ اگر بابا فرید بھی ہوتے تو شاید وہ بھی اسی موج میں بہہ جاتے۔

بابا فریدالدین گنج شکر کی ولایت نے ایسا کراماتی روپ اختیار کیا کہ ان کا اثر صرف ہانسی تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ پورے پنجاب، لاہور، ملتان اور دہلی تک ان کی روحانی ضیاء کی شہرت پھیل گئی۔

بابا فرید نے ولایت کی روایت کو اتنی پختہ شکل عطا کی کہ ان کی ولایت کی روحانی روشنی نے شیخ نظام الدین اولیاء جیسا صوفی پیدا کیا، جو 'محبوبِ الٰہی' کے لقب تک پہنچ گئے۔ بابا فریدالدین گنج شکر نے اپنی ولایت کے کام کو جاری رکھنے کے لیے درج ذیل خلفاء کو مامور کیا۔

1. شیخ جمال الدین ہانسوی
2. شیخ بدرالدین اسحٰق
3. شیخ نظام الدین اولیاء
4. شیخ علی احمد صابر (کلیر شریف، رڑکی)
5. شیخ عارف

6. شیخ بدرالدین متوکل

7. مولانا فخرالدین اصفہانی

شیخ جمال الدین ہانسوی بابا فرید کے سب سے عزیز خلیفہ تھے۔ بابا فرید کو ان سے انسیت تھی وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ شیخ جمال الدین واقعی میں ہمارا جمال ہے۔ بابا فرید ان سے محبت کی وجہ سے بارہ سالوں تک ہانسی میں ہی پڑے رہے۔ بابا فرید کا برتاؤ ایسا تھا کہ جب بھی وہ کسی کو خلافت نامہ عطا کرتے تھے، تو کہتے تھے کہ جمال الدین سے اس پر دستخط کروالینا۔ شیخ جمال الدین کا انتقال بابا فرید کی زندگی میں ہی ہوگیا[7]۔ مولانا برہان الدین صوفی ان کے صاحبزادہ تھے۔ شیخ جمال الدین کی ایک خادمہ تھی، جو عبادت اور ریاضت کی وجہ سے ام المومنین کہلاتی تھی۔ شیخ جمال الدین کے انتقال کے بعد انھیں بابا فرید کی خدمت میں لایا گیا۔ بابا فرید نے ان کو اپنا خلیفہ مقرر کرلیا۔ مولانا برہان الدین، بابا فرید کے حکم کے مطابق ہمیشہ نظام الدین اولیاء سے ملنے جایا کرتے تھے۔ جب ان کے پاس مرید بننے کے لیے کوئی آتا تھا تو کہتے تھے کہ نظام الدین اولیاء کے رہتے ہمیں مرید بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ ان سے بہت زیادہ عقیدت رکھتے تھے۔ شیخ قطب الدین منور، مولانا برہان الدین کے صاحبزادہ تھے اور شیخ نظام الدین اولیاء کے سب سے عزیز خلیفہ بھی تھے[8]۔

شیخ بدرالدین اسحٰق، بابا فرید کے داماد، خلیفہ اور ان کے خدمت گزار تھے۔ وہ روحانی تعلیم کے ماہر تھے، جو چند مسائل کے حل کے لیے بخارا تک گئے، لیکن اخیر میں لوٹ کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کو ان سے خاص انسیت تھی۔ ان کے اعزاز و احترام کے سبب شیخ نظام الدین اولیاء نے کسی سے 'بیعت' نہیں لی۔ بابا فرید کی وفات کے بعد شیخ بدرالدین اسحٰق، بابا فرید کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین سلیمان سے تعلقات خوش گوار نہ ہونے کے سبب پاک پٹن چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کی[9]۔

بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ جن حضرات نے بابا فرید کی راہ کو ہموار کرنے میں اپنی زندگی لگا دی وہ درج ذیل ہیں[10]:

1. شیخ نصرالدین نصراللہ :- یہ بابا فرید کے سب سے بڑے صاحبزادہ تھے۔ ان کے ایک

بیٹے شیخ بایزید تھے، جو شیخ نظام الدین اولیاء کے سب سے عزیز خلیفہ تھے۔ شیخ کمال الدین، شیخ بایزید کے بیٹے تھے جو مالوہ میں چشتیہ سلسلے کی تبلیغ واشاعت میں اہم مقام رکھتے تھے۔

2. **شیخ شہاب الدین** :- شیخ نظام الدین اولیاء سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے چھ صاحبزادے تھے: شیخ حسام الدین، شیخ عبدالحمید، شیخ مسعود، شیخ علی شیر، شیخ محمد، شیخ جمشید، جن کی مکمل تفصیل 'جواہر فریدی' میں بیان کی گئی ہے۔

3. **شیخ بدرالدین سلیمان** :- یہ بابا فرید کے تیسرے صاحبزادہ تھے، جو والد کی جگہ پر گدی نشین ہوئے۔ ان کے صاحبزادے شیخ علاء الدین (اجودھنی) ایک مشہور صوفی تھے، جن کا مرید سلطان محمد تغلق تھا، جس کا تذکرہ برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں ملتا ہے۔ شیخ علاء الدین کے دو بیٹے تھے: شیخ معزالدین اور شیخ علم الدین۔ شیخ معزالدین کو سلطان محمد تغلق نے مذہب کی تبلیغ وترویج کے لیے گجرات بھیج دیا اور شیخ علم الدین کو شیخ الاسلام بنا دیا۔ شیخ معزالدین کے ایک صاحبزادہ افضل الدین فضیل تھے۔ شیخ علم الدین کے ایک صاحبزادہ مظہر الدین تھے، جنھیں والد کے بعد 'شیخ الاسلام' کا عہدہ حاصل ہوا۔

4. **خواجہ نظام الدین** :- یہ بابا فرید کے سب سے محبوب بیٹے تھے جو بلبن کی فوج میں برسر روزگار تھے۔ ان کے ایک بیٹے خواجہ ابراہیم تھے، جن کے ایک لڑکے خواجہ عزیز الدین تھے، جو شیخ نظام الدین اولیاء کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔

5. **شیخ یعقوب** :- یہ بابا فرید کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ انھوں نے امروہہ کے قریب سکونت اختیار کی۔ امروہہ کے جاٹوں نے انھیں قتل کر دیا۔ ان کی مزار امروہہ کے محلہ شیخ سدّو میں ہے۔ ان کے دو صاحبزادے تھے: خواجہ معزالدین جو دیوگیر چلے گئے، اور خواجہ قاضی دہلی میں ہی اقامت پذیر ہوئے۔

7. **بی بی مستورہ** :- ان کے صاحبزادہ خواجہ عزیز صوفی جو شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ان کے صاحبزادہ خواجہ قطب الدین حسن جو شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کے

شاگرد اور خلیفہ تھے۔

8. بی بی فاطمہ :- بابا فرید کی سب سے پیاری بیٹی تھیں، جن کے دو صاحبزادے خواجہ محمد اور خواجہ موسیٰ تھے، جو شیخ نظام الدین اولیاء کے شاگرد تھے۔ بی بی فاطمہ کی مزار دہلی کے ادھ چنی گاؤں میں بی بی زلیخا صاحبہ کی مزار مبارک کے قریب واقع ہے۔

اس طرح جب ہم بابا فرید کے خلیفہ اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کے بارے میں مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے زیادہ تر شیخ نظام الدین اولیاء کے حلقہ بگوش میں ہی کام کر رہے تھے اور بعض سلطنت کے خدمت گزار بن گئے۔

شیخ نظام الدین اولیاء (1233-1325ء، دہلی)

ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کو قائم کرنے کا کام خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے کیا جسے بابا فرید نے استقامت عطا کی اور اس کی توسیع و فروغ کا کام شیخ نظام الدین اولیاء نے کیا۔ ان کے عہد میں ولایت صرف دہلی تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس کی روشنی ہندوستان کے کونے کونے تک پھیل گئی۔

شیخ نظام الدین اولیاء کے خلفاء کے کام اور ان کے اثرات کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے 'گلزارِ ابرار' میں بیان ملتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء کا عہد ہندوستان کا ایک عجیب و غریب دور تھا۔ آپ کے یہاں سے ہر روز نئے نئے خلیفہ پیدا ہوتے تھے جن کے کاموں سے ہندوستان کا ہر حصہ روشن ہو اٹھا۔ ایک جگہ ذکر ہے کہ آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور دیہاتوں میں ایسے باا ثر اور کراماتی خلیفہ پیدا کر کے بھیجے جنھوں نے اپنی محنت و کوشش، قابلیت و لیاقت اور اپنے بلند کردار و اخلاق سے مکمل ہندوستان کو روشن کر دیا[11]۔

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنی تحریروں میں جن اہم خلفاء کا ذکر کیا ہے، وہ درج ذیل ہیں[12]:

1. شیخ نصیر الدین محمود 'چراغ دہلی'
2. مولانا شمس الدین یحییٰ

3. شیخ قطب الدین منور

4. مولانا حسام الدین ملتانی

5. مولانا فخر الدین زرادی

6. مولانا علاء الدین نیلی

7. مولانا وجیہ الدین یوسف

8. مولانا سراج الدین عثمان

9. مولانا شہاب الدین امام

10. شیخ برہان الدین غریب

11. قاضی محی الدین کاسانی

12. خواجہ محمد امام

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (1276-1356ء، دہلی)

شیخ نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی چشتیہ سلسلہ کے سب سے مشہور و معروف صوفی مانے جاتے ہیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنا لباس اور اجداد سے ملی چھڑی، قرآن مجید اور دیگر اشیاء 'چراغ دہلی' کو ہی عطا کی تھیں، جنھوں نے محمد بن تغلق (1325-1351ء) کے ذریعے لگائی گئی پابندیوں کے باوجود بھی بڑے ہمت وحوصلہ کے ساتھ دہلی میں چشتیہ سلسلہ کے چراغ کو پوری آب وتاب کے ساتھ سنبھالے رکھا۔ سلطان محمد تغلق کی وفات کے بعد فیروز شاہ تغلق کو تخت پر بٹھانے میں ان کا اہم کردار رہا۔ جان کنی کے وقت جب آپ کے خانقاہی شاگردوں نے آپ کے جانشین کی تقرری کے لیے فہرست پیش کی تو آپ نے اسے دیکھ کر کہا کہ "ان لوگوں کو اپنے ایمان کا غم کھانا چاہیے، اس کی کہاں گنجائش ہے کہ یہ لوگ دوسروں کے بوجھ اٹھا سکیں[13]۔" مرتے وقت یہ وصیت کی کہ "میرے دفن کے ساتھ چشتیہ خواجگان کے ذریعے روایتی طور سے حاصل ہوئے خرقہ کو میرے ساتھ قبر میں رکھ دیں۔ میرے

پیرہن دبی ہوئی چھڑی، میرے بغل میں ہو۔ ان کی تسبیح میری شہادت کی انگلی میں لپیٹ دیں۔ ان کی چوکی اور کھڑاؤں بھی میرے ساتھ قبر میں دفن کر دیا جائے۔"

یہ اشیاء خواجہ معین الدین چشتی کی تھیں، جو بابا فرید سے ہوتے ہوئے شیخ نظام الدین اولیاء کو ملی تھیں اور محبوب الٰہی نے انھیں دیا تھا۔ وہ تمام تحفہ وخرقہ جو چشتیہ سلسلہ کے اہم صوفی کے ذریعے ایک دوسرے تک منتقل ہوتی آ رہی تھیں، یہ سبھی اشیاء چراغ دہلی کے ساتھ دفن ہو گئیں، لیکن ان کے خلیفہ سید محمد گیسو دراز نے ان کی چارپائی کی رسیاں نکال کر اپنے گلے میں ڈال لیں جس پر ان کو آخری غسل کرایا گیا تھا، اور کہا کہ میرے لیے اپنے پیر کا یہی خرقہ کافی ہے۔

اس طرح شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے اپنا جانشین کسی کو مقرر نہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ولایت کوئی عام مقام نہیں ہے جو سب کو مل جائے۔ مرید، خلیفہ اور پیر کا مرتبہ پانے والے بہت ہوتے ہیں، لیکن ولایت کو حاصل کرنا اور اس مقام پر پہنچنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ہمارے مریدوں اور خلفاء کی تعداد تو بہت ہے لیکن کسی کے اندر وہ طاقت نہیں ہے جو خدا کی رضا حاصل کرنے کے لیے دنیا کی تمام پریشانیوں کو جھیل سکے۔ چراغ دہلی نے وقت کے بدلتے ہوئے منظر نامے کو دیکھا تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ اب ولایت کے درجہ تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ولایت ان حضرات کو حاصل ہوئی، جنھوں نے صحیح معنوں میں خود کو اپنے رب (اللہ) اور اس کے دین کے تئیں قربان کر دیا، یعنی اپنے تمام اعصاب کو خدا کے حکم اور اس کی رضا کے تابع کر دیا۔ ان کی تمام خواہشیں اللہ کی خواہشوں کے مطابق ہوں، یعنی خدا کی مرضی ہی ان کی مرضی بن گئی ہو، انہی کو ولایت حاصل ہوئی۔

معارج الولایت میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے خلفاء کا بیان ملتا ہے، جو اس طرح:

1. سید محمد گیسو دراز
2. میر سید محمد بن جعفر علی مکی
3. ملک زادہ احمد
4. مولانا معین الدین عمرانی

5. شیخ یوسف
6. محمد مجیر وجیہ ادیب
7. میر سید علاء الدین
8. قاضی محمد صابی
9. شیخ سلیمان ردولی
10. شیخ محمد متوکل قنطوری
11. شیخ صید اللہ کسادار
12. شیخ عین الدین قتال
13. شیخ دانیال
14. شیخ قیام الدین
15. میر سید علاء الدین قنطوری
16. قاضی عبد المقتدر
17. مولانا احمد تھانیسری
18. شیخ زین الدین
19. شیخ صدر الدین حکیم

سہروردیہ سلسلہ کے صوفیاء

منگولوں کے حملوں کے نتیجہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی عجم چھوڑ کر ہندوستان چلے آئے اور یہاں پر سہروردیہ سلسلہ کی بنیاد ڈالی، جن کے مشہور خلیفہ درج ذیل ہیں:

1. شیخ جمال الدین تبریزی جنھوں نے بنگال میں سکونت اختیار کی۔
2. قاضی حمید الدین ناگوری جو دہلی میں سرگرم تھے۔

3. سید نور الدین مبارک غزنوی جو دہلی میں سرگرم عمل تھے۔
4. شیخ بہاء الدین زکریا جو ملتان میں سرگرم عمل تھے۔
5. مولانا مجد الدین حاجی جو دہلی کے مہرولی میں سرگرم عمل تھے۔
6. شیخ ضیاء الدین رومی جو دہلی میں سرگرم عمل تھے۔

ہندوستان میں سہروردیہ سلسلہ کی بنیاد شیخ شہاب الدین سہروردی نے ڈالی، لیکن اسے پختگی اور وسعت و مضبوطی عطا کرنے کا سہرا شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سر جاتا ہے۔

شیخ جلال الدین تبریزی نے اپنی کڑی محنت سے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ ہانسی، دہلی اور بدایوں میں سہروردیہ خانقاہیں قائم کیں، لیکن مستقل طور پر کام بنگال میں شروع ہوا۔ انھوں نے وہاں ایک عظیم الشان خانقاہ قائم کی۔ ان کے وسیلہ سے بے شمار ہندوؤں نے مذہب اسلام قبول کیا[14]۔

قاضی حمید الدین ناگوری نہایت اعلیٰ پایہ کے ایک عالم و دانشور تھے۔ ان کے ذریعے کیے گئے کام علماء کے نزدیک کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت 'سماع' (قوالی) منعقد کرنے اور اس کی منظم شکل کو سجانے سنوارنے میں صرف ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنا کوئی خلیفہ نہیں بنایا[15]۔

سید نور الدین مبارک غزنوی، مولانا مجد الدین حاجی اور شیخ ضیاء الدین رومی نے دہلی سلطنت سے اپنا تعلق قائم کر کے، دہلی میں سہروردیہ سلسلہ کو نہایت مؤثر طریقے سے پھیلایا۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی ان تمام سہروردیہ خلفاء سے مختلف تھے۔ انھوں نے مسلم ممالک کا سفر کر کے، وہاں کے مسلمانوں کے مسائل کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنی فکر کے ذریعے ان کے حل کی جانب خاص طور سے توجہ مبذول کی۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھیں۔ تصوف کی راہ کی تفصیل اس طرح بیان کی کہ اس کے فروغ کی راہیں پوری طرح ہموار ہو گئیں۔ ملتان میں واقع ان کی خانقاہ میں روحانی کاموں کے علاوہ سیاسی مسائل پر بھی غور کیا جاتا تھا، یعنی ان کی خانقاہ سیاسی مرکز کے طور پر بھی کام کرتی تھی۔ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے سات بیٹے اور متعدد خلیفہ پیدا ہوئے، جو خاص کر سندھ اور ملتان میں سرگرم عمل تھے[16]۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے اپنا جانشین اور ملتان خانقاہ کا اہم سجادہ نشین اپنے بیٹے شیخ

صدرالدین عارف کو مقرر کیا۔ شیخ صدرالدین عارف کے اہم خلیفہ سید جلال الدین سرخ بخاری نے 'اُچ' میں سہروردیہ کے مرکز کے طور پر ایک اہم خانقاہ کی تعمیر کی۔ ہندوستان میں سہروردیہ کے دو اہم مراکز تھے، اوّل ملتان اور دوم اُچ، جہاں سے پورے ہندوستان کی خانقاہوں کے انتظامی امور کو چلایا جاتا تھا[17]۔

صوفی، ولی اور ولایت کا مطلب

جو صوفی متقی اور پرہیزگار ہو، اور تقویٰ پر ہمیشہ خود کو قائم رکھے، وہی ولی کے درجے تک پہنچتا ہے اور اسے ہی ولایت حاصل ہوتی ہے۔ متقی، پرہیزگار اور تقویٰ کے بارے میں اللہ سبحانہ تعالیٰ سورۃ بقرہ کے رکوع نمبر 22 اور آیت نمبر 77 میں فرماتا ہے کہ "متقی وہ لوگ نہیں جو مغرب کی طرف منہ کر کے عبادت کریں، بلکہ وہ لوگ ہیں جو آخرت، فرشتے اور اللہ کی کتاب 'قرآن' اور اس کے بھیجے پیغمبر کو دل سے مانیں، اللہ کی محبت میں اپنا مال، اپنے عزیز و اقارب، یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کریں، غلاموں کی آزادی پر صرف کریں، نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، جو وعدہ کریں اسے ہر قیمت پر پورا کریں، تنگی اور مصیبت کے وقت حق و باطل کی جنگ میں صبر سے کام لیں، یہی لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں[18]۔"

پرہیزگار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ظلم کو بھی برداشت کرے اور صبر سے کام لے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے، باطل پر حق کو ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ ظلم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے، تو وہ متقی پرہیزگار نہیں ہو سکتا۔

"ولی اور ولایت کے معنی کے بارے میں جب مطالعہ کرتے ہیں تو عربی لغت اور قرآن و حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ولی کا مطلب قریب، دوست، بااختیار، کارساز، مددگار، ساتھی، وارث ہوتا ہے۔"

یعنی صبر و تحمل کے ساتھ اللہ پر یقین رکھنے والے شخص کا حامی و ناصر اور حقیقی دوست اللہ تبارک وتعالیٰ ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اللہ کا مددگار اور دوست ہوتا ہے۔ اس کا اخلاق و کردار اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق ہوتا ہے، یعنی اس کی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے بتائے گئے راستے پر گزرتی ہے اور وہ ان احکامات کی پوری پیروی کرتا ہے اور ان کا محافظ ہوتا ہے۔ جس کی ہر خواہش اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مطابق

ہو وہی اللہ کا ولی ہوتا ہے، اور اسے ہی اللہ کی ولایت یعنی قرب و محبت حاصل ہوتی ہے۔

شیخ علی ہجویری کا کہنا ہے کہ متقی، پرہیزگار اور اللہ کے ولی کی یہ پہچان ہے کہ اس کے برتاؤ اور بہترین اخلاق کے درمیان ایک تناسب ہو۔ ولایت نہ تو تعلیم سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی کڑی ریاضت سے، بلکہ احسن اخلاق سے حاصل ہوتی ہے، جس کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں :

1. خدا کے احکام کو بغیر کسی ریا یا دکھاوے کے پوری طرح دل سے ماننا اور اس پر عمل کرنا۔
2. بڑوں کی عزت کرنا اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا۔
3. اپنے تمام اعصاب کو قابو میں رکھنا اور ان سے آزادی حاصل کرنا، یعنی نفسیاتی خواہشات کا غلام نہ بننا۔

ایک دوسرے مقام پر شیخ علی ہجویری کہتے ہیں کہ "اللہ ہر دور میں اپنے بندوں میں سے کسی ایک کو اپنا ولی بناتا ہے تاکہ اللہ کی عظمت اور اس کے رسول کی رسالت کی صداقت ثابت ہوتی رہے۔ ایسے بندے ہر زمانے میں ہوتے ہیں جو اخیار، ابدال، ابرار، قطب یا غوث بن کر آتے رہے۔"

جنید بغدادی کہتے ہیں انبیاء اولیاء سے افضل تر ہیں اور اولیاء فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ولایت کی روایت ہندوستان میں تیرہویں صدی عیسوی سے قبل وجود میں آچکی تھی، لیکن تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں اپنی ارتقاء کے بام عروج تک پہنچ گئی۔

ہندوستان میں صوفیاء کرام کا کارنامہ

ہندوستان میں صوفی تحریک کا آغاز ملتان اور لاہور سے ہوا۔ لاہور کے بعد اس کا اہم مرکز پنجاب، اجودھن اور دہلی بنا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی قیادت میں دہلی میں جس تحریک کی بنیاد ڈالی گئی وہ ایک بڑے پیمانے پر تھی۔ یہ ہندوستان کا ایک عجیب و غریب دور تھا۔ ان کی ولایت سے ہر روز نئے نئے خلیفہ پیدا ہوتے تھے، جن کی روشنی سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ روشن ہوا تھا۔ "ایک جگہ ذکر ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے بڑے بڑے شہروں میں عظیم دانشور اور اعلیٰ کرامات والے 700 خلیفہ پیدا کیے جنھوں نے ایسی روشنی پیدا کی کہ پورا ہندوستان اس سے روشن ہوا تھا۔"[19]

(گلزار ابرار، اردو، ص 85-84)

شیخ نظام الدین اولیاء کے ذریعے دہلی میں قائم کردہ مرکز اور اس کی مرکزی اہمیت، ان کے خلیفہ شیخ نصیر الدین محمود 'چراغ دہلی' کے بعد ماند پڑنے لگی۔ صوفی تحریک کا مرکز اب دہلی نہ ہو کر پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کے ذریعے پیدا کردہ خلفاء نے پورے ہندوستان میں صوفی تحریک کو اپنے اپنے طریقے سے منظم کر کے اس کی ترویج و ترقی کا کام شروع کیا۔ سہروردیہ اور چشتیہ سلسلے کے بعد اب ہندوستان میں مختلف ناموں سے یہ سلسلے صوفی تحریک کا حصہ بننے لگے، جیسے شطاریہ، مداریہ، فردوسیہ، صابریہ، قادریہ، قلندریہ، نقش بندیہ اور دیگر کئی سلسلے وجود میں آئے جو پورے ہندوستان میں منظم طریقے سے ایک ادارہ کی شکل میں کام کر رہے تھے۔

سندھ، ملتان، اُچ، لاہور، پنجاب اور اجودھن، اجمیر (راجستھان) سے فروغ حاصل کرتے کرتے یہ صوفی تحریک ایک منظم شکل میں دہلی میں قائم ہوئی اور اس نے محمد بن تغلق کی دہلی چھوڑ دینے کی حکمت عملی کے نتیجہ میں مختلف علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔ دہلی کے بعد گجرات، جونپور، پنجاب، بہار، بنگال، کشمیر، اتر پردیش اور گوالیر میں نہایت منظم شکل میں اس کے مراکز قائم کیے گئے اور اٹھارویں صدی عیسوی تک یہ صوفی تحریک ہندوستان کے تمام حصوں میں پھیل گئی اور ملک کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں اس تحریک کے مراکز قائم کیے گئے۔ صوفیوں نے اس تحریک کو نہایت پختہ اور منظم طریقے سے چلایا، اور اس کے توسط سے مذہب اسلام کے مقدس پیغام کو ہندوستان کے تمام گوشوں کے عوام تک پہنچا دیا۔

ہندوستان میں کچھ ایسے صوفی پیدا ہوئے جو اپنی ذات میں خود ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے اور انہی اداروں کی بدولت صوفی تحریک پورے ہندوستان میں پھیلی، جن میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ سیف الدین عبدالوہاب جیلانی ناگو، شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری، شیخ قطب الدین بختیار کاکی دہلوی، قاضی حمید الدین ناگوری (دہلی)، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (پنجاب)، مخدوم علاء الدین احمد صابر کلیری، شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی، شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری (بہار شریف)، شیخ بو علی قلندر (پانی پت)، شیخ نصیر الدین محمود 'چراغِ دہلی'، سید محمد غوث گوالیری، خواجہ باقی باللہ (دہلی)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مولانا شہباز بھاگلپوری، شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی، شیخ شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی، خواجہ محمد سلیمان تونسوی، شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا سید وارث علی شاہ (دیوا شریف، یوپی)، میر سید علی ہمدانی (کشمیر)، اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خاں قادری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

1. شیخ محمد اکرام، آب کوثر، (اردو)، دہلی، (1991)، ص 74
2. ایضاً، ص 76
3. ایضاً، ص 82
4. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، (1953)، ص 47
5. ایضاً، ص 154
6. ایضاً، ص 185
7. ایضاً، ص 164-163
8. ایضاً، ص 164
9. ایضاً، ص 165
10. ایضاً، ص 170
11. ایضاً، ص 175
12. ایضاً، ص 176
13. ایضاً، ص 188
14. خلیق احمد نظامی، Some Aspect of Religion and Politics in India during the 13th Century، نئی دہلی، (1974ء)، ص 220
15. ایضاً، ص 221
16. ایضاً
17. ایضاً، ص 224
18. سید احمد عروج قادری، اسلامی تصوف، دہلی، (1980)، ص 38
19. خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، دہلی، (1953)، ص 175

○❖○

چوتھا باب

خانقاہوں کا قیام اور ان کی سماجی اہمیت اور سلطنت سے تعلق

خانقاہ کا مطلب

مذہب اسلام کے پیغام کو عام آدمی تک پہنچانے نیز صوفیاء کرام کی عبادت و ریاضت کے کام کے ساتھ اسلام کی تعلیمات کو عام فہم شکل میں پھیلانے کے مرکز کو خانقاہ کہا جاتا ہے۔ خانقاہ لفظ کے مفہوم کے سلسلے میں بڑا تنازع ہے۔ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی نے اپنی ملفوظات ''خیر المجالس'' میں خانقاہ کا مطلب اس طرح سے واضح کیا ہے'' خانقاہ دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ خانہ + قاہ۔ خانہ کا مطلب ہے گھر اور قاہ کا مطلب عبادت یا دعا۔ اس طرح خانقاہ کا مطلب عبادت کا گھر ہے[1]۔

خانقاہ کی سماجی اہمیت

محمد غوری کے ہندوستان فتح کرنے کے بعد، ہندوستان میں ترکی سلطنت کی ابتدا کے ساتھ ہی شمالی ہند میں خانقاہ کا قیام اور اسلام مذہب کے پھیلانے کا کام شروع ہوگیا۔ عہد وسطی میں ترکی حکمرانوں کا ہندوستانی سماج کی پچھڑی قوم دلت مزدور اور شودر لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنی سلطنت اور اس کی توسیع میں ہی لگے رہے۔ ہندوستانی سماج سے انکا کوئی مطلب نہیں

رہا۔ اس وقت ہندوستانی سماج اور اس کے مسائل سے جڑ کر کام کرنے کا ایک ہی مرکز تھا اور وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم خانقاہیں تھیں۔ جہاں ہندو، مسلم، مرد، عورت، امیر اور غریب سبھی طبقے کے لوگ ساتھ بیٹھ سکتے تھے۔ یہاں کسی بھی طرح کا بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہندوستان میں اونچ نیچ، چھوا چھوت اور سماجی تفریق جیسے گھٹن سے بھرے ماحول میں یہ خانقاہیں جو زیادہ تر گاؤں میں قائم کی گئی تھیں وہاں کے سماج کے امن وسکون کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ لوگ خانقاہ سے جڑتے گئے اور ان صوفیاء کے کردار، محبت اور انسانی ہمدردی سے متاثر ہوکر اسلام مذہب کی طرف مائل ہوتے گئے[2]۔

بلبن نچلے طبقے کے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ خانقاہ میں آیا تو دیکھا کہ یہاں لوگوں کا ہجوم ہے، جس میں سبھی طبقے کے لوگ ایک ساتھ بیٹھے ہیں۔ اس طرح کا ماحول دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا کہ حقیقت میں سلطنت تو خانقاہوں میں ہی چل رہی ہے۔ یہاں سبھی طبقے کے لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ میرا رشتہ تو صرف مخصوص طبقہ کے لوگوں سے ہے[3]۔

سلطنت سے صرف اونچی اور پڑھے لکھے اور سرمایہ دار لوگوں کا تعلق تھا، جبکہ ان خانقاہوں میں سبھی طرح کے لوگوں کو عزت دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اور مسلم سبھی طبقوں کے لوگ خانقاہی نظام سے جڑے ہوئے تھے۔ خانقاہ سے جڑے لوگوں کے انسانیت اور تعاونِ باہمی سے بھرپور کردار کی وجہ سے ہی پورے ہندوستانی سماج پر خانقاہ کا اثر دن بدن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں مؤرخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ دہلی میں دو سلطنتیں ہیں۔ ایک سلطنت سلطان کی تو دوسری خانقاہ کی۔ جس کا پورے ہندوستانی سماج پر اثر ہے۔

خانقاہ میں پورے ہندوستانی عوام کے ایک ساتھ بیٹھنے اور رابطے میں رہنے کے سبب ہی ثقافتی رسم ورواج اس طرح پروان چڑھا کہ مسلمان بھی ہندوستانی تہذیب کے مطابق ہی اسلام مذہب کا اہتمام کرنے لگے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان کی تخلیق بھی خانقاہوں سے ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں متعدد طبقے اور زبانوں کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے اور انہیں ایک دوسرے کی زبان اور بات کو سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی، دھیرے دھیرے مختلف زبانوں کے بولنے والوں سے ایک الگ زبان ''خانقاہی زبان'' کی اختراع ہوئی۔ جسے آگے چل کر 'اردو زبان' کا نام دے دیا گیا[4]۔

ہندوستانی سماج پر خانقاہوں کے اثر کے سلسلے میں ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ بلبن کی وفات کے بعد علاء الدین خلجی کے دور اقتدار تک دہلی میں چوری، کالا بازاری، قتل اور عصمت دری جیسے جرائم میں کافی کمی آ گئی تھی۔ ان سارے جرائم کو ختم کرنے میں خانقاہ میں دی جانے والی عام تعلیم کا بڑا اثر تھا[5]۔

سہروردیہ خانقاہ کے قیام کی صورت حال

ملتان میں قائم سہروردیہ کی خانقاہ کا نظام چشتیہ کی خانقاہ سے کافی مختلف تھا۔ سہروردی خانقاہ بنیادی طور سے سیاسی نظام سے جڑی ہوئی تھی۔ لیکن چشتیہ خانقاہ کو سیاسی نظام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ سلطنت اور سلطنت سے ربط رکھنے سے دور تھی۔ ہندوستان میں سہروردیہ سلسلہ کے بانی شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی تھے، جن کا سلطان محمد بن تغلق سے اچھا تعلق تھا۔ مرکزی اور علاقائی سیاسی معاملات میں خوب حصہ لیتے تھے[6]۔

شیخ بہاء الدین زکریا کی ملتان میں قائم خانقاہ ایک بہت بڑے زمینی حصے پر قائم تھی۔ جہاں ایک شخص کے ٹھہرنے یا رہنے کے لئے ایک کمرہ فراہم ہوتا تھا۔ لیکن چشتیہ کی خانقاہ جسے 'جماعت خانہ' کہا جاتا تھا، ایک بہت بڑی دالان ہال کی شکل میں ہوتی تھی، جہاں سبھی لوگ ایک ساتھ بیٹھتے تھے اور وہیں آرام بھی کرتے تھے۔ سونے اور آرام کرنے کے لئے کوئی الگ سے کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریا، ملتان میں قائم اپنی خانقاہ میں آنے والے مہمانوں کے ساتھ پورے طور پر ان کی خدمت میں نہیں لگ جاتے تھے بلکہ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کے بعد آرام کے لئے الگ کمرہ دے دیتے تھے، لیکن چشتیہ کے 'جماعت خانہ' میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کو اسی بڑے ہال میں ٹھہرنا پڑتا تھا اور سب لوگوں کے ساتھ ہی پورا وقت گزارنا پڑتا تھا۔ آرام کے لئے کوئی الگ سے کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ سہروردیہ خانقاہ کی نظامت کے لئے مستقل طور پر مالی انتظام ہوتا تھا لیکن چشتیہ کی خانقاہ کا انتظام ہر روز آنے والے تحفے پر منحصر ہوتا تھا۔ سہروردیہ خانقاہ کے نظامت کے لئے سرکار کی طرف سے جاگیر ہوتی تھی[7]۔

سہروردیہ خانقاہ بنیادی طور پر سماج کے ہر فرد کے لئے ہر وقت کھلی نہیں رہتی تھی۔ بلکہ سماج

کے کچھ معزز لوگ ہی جڑے ہوتے تھے، جن سے خانقاہ کی آمدنی جڑی ہوئی تھی، لیکن چشتیہ کی خانقاہ سماج کے ہر فرد کے لئے ہر وقت کھلی رہتی تھی 8۔

چشتیہ خانقاہ (جماعت خانہ) کی صورت حال

چشتیہ خانقاہ ایک بہت بڑی دالان (ہال) کی شکل میں ہوتی تھی۔ جسے جماعت خانہ کہا جاتا تھا۔ جس کی تعمیر میں متعدد کھمبوں کو استعمال کر کے اوپر چھت ڈالی جاتی تھی۔ اس جماعت خانہ کے ساتھ لنگر خانہ بھی ہوتا تھا۔ یہ جماعت خانہ ہر وقت عوام کے سبھی طبقوں کے لئے کھلا رہتا تھا۔ جہاں تعلیم اور تربیت کے کام چلتے رہتے تھے۔ باہر سے آئے ہوئے مسافر بھی اسی جماعت خانہ میں ٹھہرتے تھے۔ یہاں سونے اور رہنے کا الگ سے کوئی انتظام نہیں تھا، بلکہ عبادت، تعلیم اور آرام سبھی کام اس بڑے ہال میں ہی ہوتے تھے، جہاں رہنے والوں کے لئے کھانا اور پانی کا انتظام ہوتا تھا یعنی مکمل طور پر جماعت خانہ کی زندگی عوامی ہوتی تھی 9۔

اس جماعت خانہ کے اخراجات اور نظم و نسق چلانے کے لئے لوگوں کے ذریعہ دیئے گئے تحفے اور نذرانہ کی شکل میں کچھ سامان اور پیسے اکٹھے کئے جاتے تھے، جس سے جماعت خانہ کا لنگر چلتا تھا۔ لنگر ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ یہاں باہر سے آنے والے مسافروں کے لئے کھانا فراہم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ خانقاہ میں باہر سے آئے ہوئے مسافر کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، تو ایسی صورت میں اس وقت اس کے لئے گرم پانی پیش کر دیا جاتا تھا۔ یعنی اس سے لوگ یہ سمجھ جاتے تھے کہ کھانے پینے کے لئے لنگر خانہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں لوگ خانقاہ میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے 10۔

اس جماعت کی نشست اصل میں گولائی میں منعقد ہوتی تھی، جہاں شیخ بیٹھ کر پورے مجمع کو خطاب کرتے تھے اور انہیں تعلیم دیتے تھے۔ یہاں کے کام کاج کو دیکھنے کے لئے ہر دن الگ الگ آدمی کا انتخاب کیا جاتا تھا، کہ کل کے دن لنگر کا کام، مہمان نوازی کا کام، تحفے اکٹھے کرنے کا کام کون کون آدمی کرے گا؟ ہر دن الگ الگ آدمی کو یہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا اس طرح چشتیہ سلسلہ کی خانقاہیں چلتی رہتی تھیں 11۔

چشتیہ خانقاہ آدھی رات تک کھلی رہتی تھی، جہاں سبھی طرح کے لوگ، امیر غریب، سپاہی، ہندو جوگی، قلندر آتے رہتے تھے۔ یہ سبھی اپنی خواہش سے یہاں آتے تھے اور ساتھ میں کچھ تحفہ بھی ضرور لاتے تھے۔ شیخ سبھی سے مساوی طریقے پر ملتے تھے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء ایک بار اپنے مجمع میں اٹھ کر کہنے لگے کہ "مجھے سبھی کے لئے دل میں درد رہتا ہے اور میں ہمیشہ دُکھی رہتا ہوں، اسکی وجہ یہ ہے کہ جب لوگ میرے پاس آ کر اپنی پریشانی سناتے ہیں تو میرا دل دُکھی ہو جاتا ہے اور ان کی مدد کے لئے میرا دل بے چین ہو اٹھتا ہے۔ میرے دل میں تمام انسانوں کے لئے عزت و احترام ہے"۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سبھی سے بڑے ہی محبت اور اپنائیت سے ملتے تھے[12]۔

چشتیہ سلسلہ کے صوفیاء کی سلطنت سے دوری

چشتیہ کے سبھی مشہور صوفیاء نے سلطان اور اس کے دربار سے خود کو الگ تھلگ رکھا۔ کبھی بھی سلطان کے دربار میں حاضری نہیں دی۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے صرف ایک بار اپنے پیر خواجہ معین الدین چشتی کے لئے سلطان التمش کے دربار میں گئے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی اولاد میں سے کسی نے ان سے کہا کہ آپ دہلی جا کر سلطان سے ملیں اور اس سے کچھ زمین کا فرمان لے آئیں۔ اپنی اولاد کی ضد کرنے پر خواجہ معین الدین چشتی دہلی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے پاس پہنچے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اپنے پیر کے لئے سلطان التمش کے دربار میں گئے۔ شیخ فریدالدین گنج شکر نے بھی اپنے اسلاف کی طرح خود کو سلطان اور شہزادوں سے دور رکھنے کی کوشش کی[13]۔

چشتی صوفیاء صرف خود کو سلطان اور اس کے دربار سے الگ ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کے ذریعہ دیئے گئے تحفے اور جاگیر کو بھی قبول نہیں کرتے تھے۔ صرف امراء جو بہت ہی عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے تھے اور اپنے ساتھ کچھ تحفے بھی لاتے تھے، ان تحفوں کو قبول کر لیا جاتا تھا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو سلطان التمش نے کچھ جاگیر دینے کی تجویز رکھی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ شیخ حمیدالدین ناگوری سلطان کے ذریعہ بھیجے گئے تحفے کو اپنی خانقاہ کے خرچ کے لئے قبول کر لیتے تھے۔ شیخ بابا فریدالدین مسعود گنج شکر کو "اُلگ خان" نے کچھ گاؤں کا فرمان بھیجا

تو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے تو سلطان اور اس کے دربار کے ذریعہ بھیجے گئے کسی بھی طرح کے تحفے کو قبول کرنے پر اپنی خانقاہ میں پابندی لگا رکھی تھی کہ ان کے ذریعہ دی جانے والی کوئی بھی چیز قبول نہ کی جائے[14]۔

خواجہ بختیار کاکی کے پاس ملک اختیار الدین ایبک کچھ سونے کے سکے لے کر حاضر ہوا لیکن آپ نے قبول نہیں کیا۔ شیخ نور ترک کی خدمت میں رضیہ سلطان نے کچھ سونے کے سکے بھیجے، لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اگر کبھی اس طرح کے تحفے قبول کر بھی لیتے تھے تو اسے اپنے پاس نہ رکھ کر غریبوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ اس میں سے تھوڑا بھی بچا کر اپنے لئے نہیں رکھتے تھے۔ شیخ نظام الدین اولیا، ہر جمعہ کو اپنی خانقاہ میں اکٹھے تحفوں کو غریبوں اور فقیروں میں بانٹ دیا کرتے تھے[15]۔

اتنا ہی نہیں، چشتیہ صوفیاء سرکاری نوکری اور کسی بھی طرح کی سرکاری خدمت کو حاصل کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ سلطان کے ذریعہ دی جانے والی کوئی بھی رقم یا دیگر چیزیں قبول نہیں کرتے تھے۔ جب سلطان التمش نے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو شیخ الاسلام کا عہدہ قبول کرنے کے لئے گزارش کی تو انہوں نے قبول نہیں کیا[16]۔

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے سبھی خلفاء کو سرکاری نوکری سے الگ رہنے کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں خود سلطان محمد بن تغلق کی اس تجویز کو، کہ تمام صوفیاء سلطنت سے جڑ کر سلطنت کا تعاون کریں۔ سہروردیہ کے لگ بھگ تمام صوفیاء نے محمد بن تغلق کے اس حکم کو قبول کر لیا، لیکن چشتیہ سلسلہ کے خلیفہ شیخ نصیر الدین، چراغ دہلی اور قطب الدین منور، مولانا شمس الدین یحییٰ نے سلطان کے اس حکم کو ٹھکرا دیا۔ انجام یہ ہوا کہ انہیں کئی طرح کی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا[17]۔

امیر خسرو جو شیخ نظام الدین اولیاء کے سب سے عزیز شاگرد تھے۔ شیخ نظام الدین اولیاء بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ لیکن سلطنت کی خدمت سے جڑنے کے سبب انہیں خلافت نہیں دیا۔ یعنی خلافت پانے کی یہ شرط تھی کہ سرکاری خدمت سے دور رہنا ہوگا۔ شیخ نظام الدین اولیاء اپنے خلافت نامہ میں یہ ذکر کرتے تھے کہ آپ کسی بھی طرح کی سرکاری خدمت نہیں کریں گے۔ دنیاوی امور سے دور رہ کر صرف عبادت اور عوام کی خدمت کے کام سے جڑ کر زندگی گزارنی ہوگی[18]۔

سہروردی صوفی سلطان کے ذریعہ دیئے گئے تحفے اور نذرانے نیز جاگیر کو قبول کر لیتے تھے۔ شیخ رکن الدین ملتانی کا تو یہ حکم تھا کہ کوئی بھی امراء و عمائدین میری خانقاہ میں خالی ہاتھ نہ حاضر ہوں۔ اپنے ساتھ خانقاہ کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور پیش کرے۔ کچھ دولت یا کوئی چیز یا ہوشمند کارآمد اہل علم فرد خانقاہ کی خدمت کے لئے ضرور ساتھ لائیں۔ یعنی کسی نہ کسی شکل میں خانقاہ کو تعاون ضرور پیش کرے۔[19]

حوالہ جات

1. ایضاً، صفحہ نمبر 265
2. خلیق احمد نظامی، Some aspect of religon and politics in India during the thirtencentury, Delhi, (1974), صفحہ 261
3. ایضاً، صفحہ نمبر 262
4. ایضاً، صفحہ نمبر 264
5. ایضاً،
6. ایضاً، صفحہ نمبر 226
7. ایضاً، صفحہ نمبر 227
8. ایضاً،
9. ایضاً، صفحہ 205
10. ایضاً،
11. ایضاً،
12. ایضاً، صفحہ نمبر 212-213
13. ایضاً، صفحہ نمبر 242
14. ایضاً، صفحہ نمبر 244
15. ایضاً، صفحہ نمبر 245
16. ایضاً، صفحہ نمبر 246
17. ایضاً، صفحہ نمبر 247
18. ایضاً، صفحہ نمبر 247
19. ایضاً، صفحہ نمبر 251

پانچواں باب

سلطنت اور خانقاہ

دہلی سلطنت کے سلطانوں کا صوفیاء سے تعلق

سلطان التمش (1211-1236ء) کا صوفیاء سے تعلق

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور سلطان التمش

سلطان التمش ایک صوفی خیال کا سلطان تھا۔ وہ صوفیاء کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے دور میں دہلی صوفیاء کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ وہ صوفیاء کا بہت احترام کرتا تھا۔ قطب الدین بختیار کاکی سے تو وہ بہت عقیدت رکھتا تھا۔ بختیار کاکی کو وہ شیخ الاسلام مقرر کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ اس عہدہ کے لئے تیار نہیں ہوئے تو مایوس ہو کر اس نے یہ عہدہ نجم الدین صغریٰ کو دے دیا۔ مولانا نجم الدین صغریٰ شیخ الاسلام بنتے ہی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی مقبولیت کو برداشت نہیں کر سکے، اور سلطان کو ان کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ جب خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی سے ملنے آئے، تو نجم الدین صغریٰ اور بختیار کاکی کے بیچ خلش کی بو محسوس کی جس سے انہیں دلی صدمہ ہوا۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ بختیار کاکی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اپنے پیر خواجہ اجمیری کے ساتھ دہلی چھوڑ کر

جانے لگے تو سلطان التمش اور دہلی کے عوام ان کے پیچھے پیچھے کئی میل دور تک، ان کو دہلی نہ چھوڑنے کی گزارش کرتے ہوئے گئے۔ جب خواجہ معین الدین چشتی نے سلطان کو خواجہ بختیار کاکیؒ سے بے پناہ لگاؤ دیکھا تو بختیار کاکی کو پھر سے دہلی میں ہی رہنے کا حکم دے دیا[1]۔

سلطان التمش کو بختیار کاکی سے اتنا لگاؤ اور تعلق تھا کہ وہ ان سے ملنے ہفتہ میں دو بار ضرور جایا کرتا تھا۔ سلطان ان کا مرید تھا ان کے ہر حکم کا خیال رکھتا اور ان کے حکم کی تعمیل کرتا تھا[2]۔

قاضی حمید الدین ناگوری اور سلطان التمش

قاضی حمید الدین ناگوری جو شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے استاد اور گہرے دوست بھی تھے۔ وہ اپنی خانقاہ میں سماع کیا کرتے تھے۔ علماء سماع کے خلاف تھے لہٰذا اس بارے میں سلطان التمش سے شکایت کی۔ سلطان نے قاضی حمید الدین ناگوری کو بلا کر پوچھا کہ سماع کا کیا مطلب ہے۔ اسے کیوں کرتے ہیں؟ قاضی حمید الدین ناگوری نے سماع کو اس طرح سے بیان کیا کہ سلطان متاثر ہو گیا۔ سلطان التمش اس وقت سے ہمیشہ قاضی حمید الدین ناگوری کے مریدوں کے ساتھ سماع میں حاضر ہونے لگا[3]۔

سلطان التمش تمام صوفیاء کا احترام دل سے کیا کرتا تھا۔ اس وقت کے مشہور صوفی جلال الدین تبریزی، شیخ بہاء الدین زکریا، شیخ نجیب الدین بخشی، قاضی قطب الدین کسانی اور قاضی حمید الدین ناگوری جیسے صوفیاء کو سلطان التمش بڑے احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتا تھا[4]۔

رضیہ سلطانہ (1236-1240ء)

مولانا نور ترک اور رضیہ سلطانہ

التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ نے، اپنے وقت کے مشہور صوفی مولانا نور ترک کی خدمت میں نذرانے کی شکل میں کچھ سونا بھیجا۔ لیکن انہوں نے اسے قبول نہیں کیا۔ اس شاہی تحفے کو اپنی چھڑی سے پیٹنا شروع کر دیا اور کہا کہ جلد اسے میرے سامنے سے لے جاؤ[5]۔ رضیہ سلطانہ کو ان سے بے حد عقیدت تھی، موت کے بعد انہیں کے نزدیک دفن بھی ہوئی۔

سلطان نصیر الدین محمود (1246-1266ء) کا صوفیاء سے تعلق

بابا فرید اور سلطان نصیر الدین محمود

سلطان نصیر الدین محمود مذہبی خیال کا سلطان تھا۔ وہ تمام صوفیاء کا احترام کرتا تھا۔ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ اور بابا فرید الدین مسعود گنج شکر سے بہت متاثر تھا۔ ان سے عقیدت کی وجہ سے ہی سلطان نصیر الدین کو اپنی سلطنت کا ولی عہد بلبن کو بنا کر خود خدا کی عبادت میں لگ گیا[6]۔

سلطان غیاث الدین بلبن (1266-1286ء) کا صوفیاء سے تعلق

سلطان غیاث الدین بلبن بھی علماء اور صوفیاء کا بہت احترام کیا کرتا تھا۔ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد وہ علماء اور صوفیاء سے ملنے جایا کرتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد وہ تمام صوفیاء کے مزار پر حاضر ہوتا تھا۔ ایسے ا[illegible] ہبی خیال کو دیکھ کر صوفیاء اور علماء جو سلطنت کی نوکری کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اس کی سلطنت سے جڑ گئے۔ مولانا شمس الدین خوارزمی، مولانا شمس الدین پانی پتی اور حسن سنجری اور شمس دبیر جیسے صوفی اس کی سلطنت کے کام سے جڑ گئے۔[7]

لکھنوتی فتح کرنے کے بعد جب وہ دہلی لوٹا تو پہلے وہ ان صوفیاء کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کی خانقاہ پر پہنچا، جن میں شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، شیخ بدر الدین غزنوی، شیخ صدر الدین ملتانی، شیخ نور الدین ملک یار پرّاں، بی بی فاطمہ سام اور سیدی مولیٰ قابل ذکر ہیں جن سے سلطان بلبن عقیدت رکھتا تھا[8]۔

بابا فرید الدین اور سلطان بلبن

بابا فرید الدین مسعود گنج شکر سے سلطان بلبن کو گہرا لگاؤ تھا۔ وہ ان سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی بابا فرید سے کر دی[9]۔

ایک [illegible]ان بلبن بابا فرید کی خدمت میں بہت ساری چاندی، اور چار گاؤں کا فرمان لے کر پہنچا۔ بابا فرید نے پوچھا یہ سب کیا ہے؟ بلبن نے کہا "یہ چاندی اور کچھ گاؤں کے فرمان

(نذرانہ) تحفے کی شکل میں قبول کر لیجئے۔" بابا صاحب نے ہنس کر کہا کہ "یہ نقد روپے تو مجھے دے دو۔ ہم اسے غریبوں اور فقیروں میں بانٹ دیں گے اور یہ فرمان لے جاؤ[10]۔

شیخ علی چشتی اور سلطان بلبن

بلبن کے وقت میں شیخ علی چشتی نام کے، چشت کے رہنے والے صوفی دہلی میں رہتے تھے، ان سے بلبن کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب وہ چشت اپنے ملک جانے لگے تو بلبن شیخ خواجہ علی چشتی کے قدموں پر گر گیا، اور کہا "اگر آپ چشت چلے جائیں گے تو میں بھی سلطنت چھوڑ دوں [illegible] چشت آپ کے ساتھ چلا جاؤں گا۔" جب خواجہ علی نے بلبن کی یہ صورت حال دیکھی تو چشت جانے کا ارادہ بدل دیا اور انہوں نے دہلی میں ہی مستقل طور سے رہنے کا فیصلہ کیا[11]۔

سلطان جلال الدین خلجی (1290-1296ء) کا صوفیاء سے تعلق

سیدی مولیٰ اور سلطان جلال الدین خلجی

سلطان جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے دورِ سلطنت میں، سیدی مولیٰ نام کے ایک مشہور صوفی تھے، جن کی خانقاہ دہلی میں ہی تھی۔ ان کی خانقاہ میں فقیروں اور دیگر لوگوں کی ایک لمبی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ خانقاہ کے لنگر میں دو ہزار من میدہ اور پانچ سو من گوشت ہر دن خرچ ہوتے تھے، اور کھانا خانقاہ میں ہی بٹتا تھا۔ سیدی مولیٰ کی خانقاہ کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر دیگر صوفیاء اور علماء ان سے حسد کرنے لگے اور سلطان جلال الدین خلجی سے یہ شکایت کی کہ سیدی مولیٰ سلطان کا عہدہ لینا چاہتا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ایک دن وہ دہلی کا سلطان بن بیٹھے گا۔ سلطان جلال الدین خلجی نے سیدی مولیٰ کی خانقاہ کی شہرت اور اس میں اکٹھے بھیڑ کو دیکھ کر خوفزدہ ہوا تھا، اور اسے لگا کہ سیدی مولیٰ ایک دن سلطان کے عہدہ تک پہنچ سکتا ہے۔ سیدی مولیٰ کو دربار میں بلایا اور ان پر سلطنت کے تخت پلٹنے کی سازش کرنے کا الزام لگا کر، سزائے موت دے دی۔ اس حادثے کے بعد دہلی میں دو برس تک ایک بوند بھی بارش نہیں ہوئی۔ لوگ کھانے کے لئے ترس گئے[12]۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان جلال الدین خلجی

جب سلطان جلال الدین خلجی کو یہ پتہ چلا کہ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں لوگ بڑی

ہی تنگی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ خانقاہی لوگ روزہ رکھ کر کئی کئی دنوں کے بعد کھانا کھاتے ہیں۔ اس نے براہ راست کچھ تحفہ شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور یہ گزارش کی کہ اگر شیخ حکم دیں تو میں خانقاہ کے لئے کچھ گاؤں دے دوں۔ لیکن محبوبِ الٰہی نے جواب دیا کہ مجھے اور میرے خانقاہی لوگوں کے لئے تمہارے گاؤں کے لوگوں کے چندے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا اور میرا پالنے والا اللہ ہے اور اسی کی مدد ہمارے لئے کافی ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی نے محبوبِ الٰہی سے ملنے کی خواہش کئی بار ظاہر کی، لیکن شیخ نے سلطان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ ایک دن بغیر اطلاع دیئے سلطان خانقاہ میں حاضر ہونا چاہا۔ اس بات کی اطلاع امیر خسرو کو مل چکی تھی، جو سلطان کے منصف دار تھے۔ امیر خسرو شیخ نظام الدین اولیاء کے سب سے عزیز مرید تھے۔ سلطان کے اس خفیہ ارادے کو اپنے پیر محبوبِ الٰہی کو بتا دیا۔ شیخ دہلی چھوڑ کر اجودھن چلے گئے۔ جب سلطان آیا تو ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ سلطان نے امیر خسرو سے یہ کہا کہ تمہارے علاوہ ہمارے آنے کی اطلاع شیخ کو کوئی اور نہیں دے سکتا ہے۔ امیر خسرو نے اس سچائی کو قبول کیا اور کہا کہ جہاں پناہ میں کیا کرتا، اگر اس بات کی اطلاع شیخ کو دے دی تو صرف جان سے ہی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اگر اس بات کی اطلاع شیخ کو نہیں دیتا تو ایمان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ سلطان امیر خسرو کا جواب سن کر خوش ہوا اور انہیں معاف کر دیا[13]۔

سلطان علاء الدین خلجی (1296-1316ء) کا صوفیاء سے تعلق

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان علاء الدین خلجی

شیخ نظام الدین اولیاء، سلطان علاء الدین خلجی کے دور کے سب سے مشہور صوفی ہیں۔ مؤرخ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ غیاث پور میں موجود شیخ کے جماعت خانے میں ایک لمبی بھیڑ ہر روز لگی رہتی تھی۔ غریب، امیر، فقیر سبھی ان کے عقیدت مند تھے۔ سبھی شیخ کی زیارت کو باعث سعادت سمجھتے تھے[14]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں عقیدت مندوں کی بھیڑ کو دیکھ کر اور ان کی شہرت کے سبب سلطان ہمیشہ تشویش میں رہتا تھا۔ اسے اس بات کی فکر تھی کہ شیخ جب چاہیں، میرا تخت پلٹ سکتے ہیں۔ لیکن ان کے خلاف کچھ بھی کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ کی سیاسی سوچ کو آزمانے کے لئے سلطان نے خط لکھا کہ میں اپنے سیاسی کاموں کو صحیح سمت دینے اور اچھے

طریقے سے چلانے کے لئے آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی کروں گا۔ جب علاء الدین خلجی کا بیٹا خضر خاں یہ خط لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو، شیخ نے خط پڑھے بغیر ہی واپس کر دیا اور کہا کہ "میں درویش ہوں، مجھے بادشاہوں اور ان کی سیاست سے کیا مطلب۔ میں سلطان اور ہر مسلمان کے لئے ہر وقت خدا سے دعا میں مشغول رہتا ہوں۔ اگر بادشاہ نے اس بار کچھ کہا تو میں یہاں سے کہیں چلا جاؤں گا۔ یہ جواب سن کر سلطان علاء الدین خلجی بہت خوش ہوا، اور کہا کہ میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ شیخ کو ان ساری باتوں سے کیا مطلب ہے۔ لوگ شیخ سے لڑا کر ہماری سلطنت کو نقصان و برباد کر دینا چاہتے ہیں[15]۔

دوسری بار علاء الدین خلجی نے ایک معذرت نامہ لکھا اور کہا کہ میں آپ کی قدم بوسی کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ شیخ نے جواب دیا کہ سلطان کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کے لئے بہت دعائیں کرتا رہتا ہوں اور غیر موجودگی میں کی گئی دعائیں ہی قبول ہوتی ہیں۔ سلطان نے پھر ان سے ملنے کی کی استدعا کی۔ شیخ نے کہا کہ میرے گھر کے دو دروازے ہیں، اگر سلطان ایک سے اندر داخل ہوگا تو میں دوسرے سے باہر چلا جاؤں گا[16]۔

سلطان علاء الدین خلجی کو شیخ سے بہت عقیدت تھی اور وہ ان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ وہ ہر پریشانی کے وقت شیخ کے پاس دعا کے لئے کہتا تھا۔ ایک بار ورنگل فتح کے لئے گزارش کی، تو شیخ نے جواب دیا کہ یہ فتح کیا اہمیت رکھتی ہے۔ ہم تو بڑے فتح کی امید رکھتے ہیں۔ اس جواب سے سلطان بہت خوش ہوا۔ اس خط کو سلطان شیخ کی دعا سمجھ کر اپنے ہاتھ کے بانہہ میں باندھ لیا اور کہنے لگا کہ ہماری فتح طے ہے۔ شیخ کی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی ہے[17]۔

ایک مرتبہ ملک قرا بیگ نے سلطان سے کہا کہ تمہیں شیخ سے اتنی عقیدت ہے تو کیوں نہیں ملاقات کر لیتے ہو۔ سلطان نے جواب دیا کہ میں بادشاہ ہوں۔ سر سے پاؤں تک میں دنیا کے معاملوں میں مصروف ہوں۔ مجھے شرم آتی ہے، اس طرح کی پاک شخصیت کی خدمت میں کیسے حاضر ہو سکتا ہوں؟ لیکن تم میرے دونوں بیٹوں خضر خاں اور شادی خان کو شیخ کی نگرانی میں ڈال دو اور دو لاکھ تنکے (کرنسی) بھی خانقاہ میں پہنچا دو۔ شیخ نے اس کے دونوں بیٹوں کو تو اپنی خدمت میں قبول کر لیا لیکن دو لاکھ تنکے واپس کر دیے[18]۔

سلطان قطب الدین مبارک خلجی (1316-1320ء) کا صوفیاء سے تعلق

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان قطب الدین مبارک خلجی

علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا مبارک خلجی نے سلطنت کی کمان سنبھالی۔ اپنے دونوں بھائیوں، خضر خاں اور شادی خان کو شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید ہونے کے سبب وہ ان دونوں سے خوف کھانے لگا اور اسے ایسا لگنے لگا کہ شیخ نظام الدین اولیاء کے تعاون سے اس کے بھائی کبھی بھی اسے تخت سے بے دخل کر سکتے ہیں۔ اس لئے شیخ نظام الدین، اولیاء کو اپنا دشمن سمجھنے لگا۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء کو ان ساری باتوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

سلطان مبارک خلجی شیخ نظام الدین اولیاء کا سخت دشمن بن گیا اور ان کے خلاف منصوبے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک شاندار خانقاہ کی تعمیر کرائی اور شیخ رکن الدین ملتانی کو ملتان سے بلایا اور اس خانقاہ میں کام کرنے کی دعوت دی لیکن شیخ رکن الدین ملتانی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے خلاف اس خانقاہ میں کام کرنے سے منع کر دیا۔ شیخ رکن الدین ملتانی کے قبول نہ کرنے پر اس نے شیخ زادہ جام کو دہلی بلا کر اس خانقاہ میں کام کرنے کا حکم دیا۔ اس خانقاہ کی تعمیر سے شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ کی شہرت اور اس میں عقیدت مندوں کی بھیڑ میں کوئی کمی نہیں آئی۔ سلطان کا یہ منصوبہ ناکام ثابت ہوا[19]۔

ایک دن سلطان نے یہ پتہ کیا کہ شیخ کی خانقاہ کا خرچ کیسے چلتا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ سلطنت کے امراء اور مملوک شیخ کو نذرانے پیش کرتے ہیں۔ ان ہی پیسوں سے ان کا لنگر چلتا رہتا ہے۔ سلطان نے اپنے دربار میں یہ اعلان کر دیا کہ کوئی بھی درباری امیر شیخ کے دربار میں نہ جائے، اور اس پر پابندی لگا دی۔ جب یہ بات شیخ نظام الدین اولیاء کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنے منتظم کو حکم دیا کہ لنگر کا خرچ بڑھا دیا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد جب سلطان نے خانقاہ چلنے کے سلسلے میں پتہ کیا تو، اسے حیرت ہوئی اور اپنے قاضی سے پوچھا کہ شیخ کی خانقاہ کے مصارف میں اضافے کی کیا وجہ ہے۔ قاضی نے بتایا ان کی خانقاہ کا خرچ ہر روز دو ہزار تنکا لنگر پر خرچ ہوتا ہے، جو امراء انہیں تحفے کی شکل میں پیش کرتے ہیں[20]۔ سلطان نے یہ سن کر حکم جاری کیا کہ اگر کوئی امیر شیخ کو تحفے کی شکل میں کچھ بھی پیش کرے تو اس کی جاگیر ضبط کر لی جائے۔ جب اس

بات کی اطلاع شیخ نظام الدین اولیاء کو ہوئی تو انہوں نے اپنے منتظم کو بلا کر یہ حکم دیا کہ خانقاہ کے لنگر کا خرچ دوگنا کر دیا جائے اور جو پیسے کی ضرورت ہو اس طاق سے نکال لیا کریں۔ اس منصوبے میں بھی سلطان ناکام ثابت ہوا[21]۔

ایک دن سلطان نے شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ شیخ رکن الدین ملتان سے مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں لیکن آپ یہیں رہ کر دربار میں نہیں آتے ہیں۔ ہفتہ میں دو مرتبہ دربار میں ضرور آئیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے کہا کہ میرے اسلاف نے مجھے دربار میں جانے سے منع کیا ہے۔ اس لئے میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں[22]۔

ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" میں لکھتا ہے کہ، سلطان اور شیخ کے درمیان اتنا تناؤ بڑھ گیا کہ سلطان نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نظام الدین کا سر لائے گا تو اسے میں ہزار تنکے انعام دوں گا[23]۔

سلطان کی اس سازش سے شیخ نظام الدین اولیاء کو بڑا صدمہ پہنچا اور آپ نے ایک خط سلطان کے پیر، شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس بھیجا، لیکن وہ خط شیخ ضیاء الدین رومی کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی، ان کی وفات ہوگئی۔ اس خط میں لکھا تھا کہ حضرت آپ سلطان کو سمجھائیے کہ وہ درویشوں کو تکلیف نہ پہنچائے[24]۔

جب شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ ضیاء الدین رومی کی موت کے بعد ان کے جنازے میں شریک ہوئے تو وہاں سلطان بھی موجود تھا۔ سلطان کو دیکھ کر شیخ نظام الدین اولیاء نے اسے سلام کیا لیکن سلطان نے جواب نہیں دیا[25]۔

دربار میں ایک قدیم رسم تھی کہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نئے چاند دیکھنے کی خوشی میں شہر کے سبھی مشائخ وعلماء وامراء، سلطان کو مبارکباد دینے کے لئے قصر شاہی میں اکٹھے ہوتے تھے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء اس موقع پر نہیں جاتے تھے، بلکہ اپنے خادموں کو اپنی جگہ پر بھیج دیا کرتے تھے۔ لوگوں نے سلطان سے یہ شکایت کی کہ شیخ خود نہیں آتے ہیں بلکہ اپنے خادموں کو بھیج دیتے ہیں جو سلطان کی شان اور وقار کے خلاف ہے۔ لوگوں کی ان باتوں کو سن کر سلطان مبارک خلجی نے طیش میں آکر شیخ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ اگر شیخ اس بار خود نہیں حاضر ہوئے تو ہم جس طرح بلوایا کرتے ہیں بلوالیں گے[26]۔

جب شیخ نظام الدین اولیاء نے سلطان کا حکم سنا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت وہ اپنی ماں کے مزار پر گئے اور ان کی طرف توجہ مرکوز کر کے کہا ''اگر سلطان اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو میں آپ کے مزار کی زیارت کے لئے کبھی نہیں آؤں گا۔[27] (سیر الاولیاء صفحہ نمبر 151)

اگلے مہینے کی پہلی تاریخ، جس دن سلطان کو مبارک باد دینے کا دن تھا۔ عنقریب اُسکے دہلی کے بڑے صوفیاء میں سے سید قطب الدین غزنوی، شیخ وحید الدین کندوجی، مولانا برہان الدین وجدوی، شیخ عماد الدین توسی جیسے صوفی شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ بادشاہ ایک ناسمجھ نوجوان ہے، آپ بزرگ ہیں، بہتر یہی ہے کہ آپ دربار میں حاضر ہو جائیں۔ شیخ نے کچھ دیر سوچ کر کہا'' انشاء اللہ دیکھئے کیا ظہور ہوتا ہے'' یعنی کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس جواب سے سبھی لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ شیخ دربار میں حاضر ہونے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء نے دربار میں حاضر نہ ہونے کا عزم کر لیا تھا۔ دھیرے دھیرے حاضری کا دن قریب آ گیا۔ ابھی مہینے کی پہلی تاریخ کی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی کہ رات میں ہی خسرو خان نے سلطان کا سر کاٹ کر قلعہ ہزار ستون کے باہر ڈال دیا۔ اس طرح شیخ نظام الدین اولیاء اس سلطان کی بے عزتی سے بچ گئے[28] (سیر الاولیاء صفحہ 151) (تاریخ فیروز شاہ صفحہ 408)۔

سلطان غیاث الدین تغلق (1320-1325ء) کا صوفیاء سے تعلق

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان غیاث الدین تغلق

سلطان غیاث الدین تغلق کے تعلقات شیخ نظام الدین اولیاء سے اچھے نہیں تھے۔ اس بات کا تذکرہ ہر موقع پر کیا جاتا ہے۔ لیکن سلطان غیاث الدین تغلق کی زندگی اور شیخ نظام الدین اولیاء سے تعلق کے سلسلے میں جب تاریخِ فیروز شاہی اور شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات اور امیر خسرو کی تحریر کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایسا نہیں لگتا ہے کہ شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان غیاث الدین تغلق کے تعلقات خراب تھے۔ اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا[29]۔

تاریخ مبارک شاہی میں یحییٰ سرہندی نے صرف یہ ذکر کیا ہے کہ جس وقت سلطان لکھنوتی جا رہا تھا، تو شیخ نے یہ کہا تھا کہ ''ہنوز دہلی دور است''۔ جب سلطان لکھنوتی کو فتح حاصل کر کے لوٹا

تو افغانپور، جو دہلی سے کچھ میل دور تھا، وہاں ٹھیرا، تو لوگوں نے شیخ سے کہا کہ دشمن تیغ سلامت دہلی لوٹ آیا۔ شیخ نے کہا "ہنوز دہلی دوراست" یعنی دہلی اس کے لئے ابھی دور ہے۔ لیکن یہ بات شیخ کی موت کے 120 سال بعد لکھی گئی[30]۔

یحیٰ سرہندی کی اس تحریر کو بنیاد بنا کر مغلیہ دور کے مورخین نے اسے سند بنا کر پیش کر دیا۔ "فرشتہ" کی اس عبارت کو ثبوت کے طور پر پیش کر کے کہا گیا کہ "فرشتہ" نے یہ لکھا ہے کہ بنگال سے واپسی پر سلطان نے یہ حکم بھیجا تھا کہ جب میں دہلی پہنچوں تو شیخ وہاں نہ ہوں۔ شیخ نے جواب دیا کہ دہلی تو ابھی دور ہے۔ جب سلطان افغان پور پہنچا تو وہ خیمہ جو اس کے استقبال کے لئے بنایا گیا تھا، وہ گر گیا اور وہ اس میں دب کر مر گیا[31]۔

"فرشتہ" نے سلطان غیاث الدین تغلق اور شیخ نظام الدین اولیاء کی وفات کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ اس طرح ہے:۔ اس کے مطابق سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات 1325 عیسوی کے 17 ربیع الثانی کے ماہ میں ہوئی۔ یعنی سلطان کی وفات کے دو ماہ بعد شیخ کا انتقال ہوا لیکن وہ لکھتا ہے کہ سلطان سے پہلے شیخ گزر گئے تھے[32]۔

یورپین مورخین نے اس حادثے کو اس طرح سے شائع کیا ہے کہ شیخ نے جونا خاں سے مل کر سلطان کے خلاف سازش رچی تھی[33]۔

غیاث الدین تغلق دیپال پور ملتان کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ ملتان کے صوفیاء سے اس کے بڑے اچھے مراسم تھے۔ شیخ علاء الدین اجودھنی اور بابا فرید سے اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے[34]۔

جب خسرو خان سلطان مبارک خلجی کا قتل کر کے مسند پر بیٹھا تو اس نے مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا دی۔ وہ دربار میں ہندو رسم کو اپنانے لگا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندو سے مسلمان ہوا تھا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد ہندو رسم کو نافذ کرنے میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ علاء الدین خلجی کے دور میں غیاث الدین تغلق کا نام غازی خان تھا، جو دہلی کے سلطان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ جب خسرو خان کی قیادت میں دہلی دربار کی صورت حال کو دیکھا تو اسے بڑا دلی صدمہ پہنچا اور اس نے اس سلطنت کو ختم کرنے کا عزم کر لیا اور اس نے دہلی پر فوج سرائی کی[35]۔

درباریوں نے اس کا استقبال کیا اور تخت اسے سونپ دیا[36]۔ مسند پر بیٹھنے کے بعد اس نے دیکھا کہ سارا خزانہ خالی ہے۔ خسرو خان نے اپنی سلطنت کی حفاظت کی خاطر علماء اور صوفیاء کو بڑے بڑے تحفے دیے تھے، جو دو دو تین تین لاکھ تنکے کی رقم تھی تا کہ ان علماء اور صوفیاء کی حمایت اسے ملتی رہے۔ دہلی کے زیادہ تر صوفیاء نے یہ رقم قبول کر لی[37]۔ لیکن بہت سارے صوفیاء نے اسے محفوظ رکھا۔ شیخ نظام الدین اولیاء جو ان سبھی صوفیاء میں سب سے مشہور تھے، جن کو پانچ لاکھ تنکا نذرانہ دیا تھا، شیخ نظام الدین اولیاء نے اس رقم کو فقیروں اور غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ جب غیاث الدین تغلق نے دیکھا کہ خزانے کی ساری رقم ان علماء اور صوفیاء کے پاس چلی گئی ہے تو اس نے اس رقم کو واپس کرنے کا حکم دیا، جن صوفیاء نے اس رقم کو محفوظ رکھا تھا، ویسے ہی سلطان کو لوٹا دیا لیکن پانچ لاکھ تنکے جب شیخ نظام الدین اولیاء سے مانگا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ رقم غریبوں یتیموں اور فقیروں کا حق تھا۔ جسے میں نے ان میں تقسیم کر دیا۔ اس جواب سے وہ چپ ہو گیا، کیونکہ وہ شیخ نظام الدین اولیاء کے اس سلوک سے واقف تھا۔ اس سلسلے میں سلطان نے آگے شیخ سے کچھ بھی نہیں کہا[38]۔

شیخ نظام الدین اولیاء سے دہلی کے کچھ علماء خلش رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دہلی کے علماء نے سلطان سے یہ شکایت کی کہ شیخ اپنی خانقاہ میں سماع کرتے ہیں، جو شریعت کے خلاف کام ہے۔ شیخ زادہ حسام الدین اور قاضی جلال الدین جو شیخ کے دشمن تھے۔ اس بات کو بڑھا چڑھا کر شیخ کے اوپر مقدمہ دائر کر دیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے شیخ نظام الدین اولیاء کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ دہلی کے علماء اور صوفیاء اس عدالت میں حاضر ہوئے۔ اس عدالت میں دہلی کے علماء شیخ نظام الدین اولیاء پر طرح طرح سے شریعت کے خلاف کام کرنے کا الزام لگانا شروع کر دیا۔ جب شیخ نظام الدین اولیاء نے ان سوالوں اور الزاموں کا جواب حدیث کی روشنی میں دینا شروع کیا تو علماء اسے سننے کو تیار نہ ہوئے[39]۔

سیر الاولیاء میں ذکر ہے کہ جب سلطان کے دربار سے شیخ لوٹے تو مولانا محی الدین کسانی اور امیر خسرو کو بلایا، اور کہا "دہلی کے علماء میری دشمنی اور مخالفت سے بھرے تھے۔ آج بہت سی بھکی بھکی باتیں کہنی شروع کی، لیکن سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ عدالت کی بحث میں نبی کریم ﷺ کی صحیح حدیث سننے سے انکار کر دیا۔ اور یہ کہتے تھے کہ یہ شہر شریعت اور فقہ اور حدیث پر قائم ہے۔

اس طرح کے علماء کو میں نے کبھی نہیں دیکھا، جو نبی کریم ﷺ کی حدیث کو سننے سے انکار کر دیں اور کھل کر کہیں کہ میں حدیث نہیں سنتا۔ اللہ نے اس طرح سے دشمنی رکھنے والوں کو اس شہر میں کیسے موجود رکھا ہے۔ اس شہر کو تو مٹ جانا چاہیے"[40]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی تحریر "سیر الاولیاء" کے مطالعہ سے یہ نہیں لگتا ہے کہ وہ سلطان سے ناراض تھے۔ لیکن حتمی طور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ علماء کے اس نازیبا سلوک سے بہت افسردہ تھے۔ یعنی برنی کے بیان اور شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات نیز امیر خسرو کی تحریر سے یہ طے نہیں ہوتا ہے کہ سلطان اور شیخ کے مابین خلش تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ سلطان اور شیخ کے درمیان اچھے تعلقات بھی نہیں تھے۔ لیکن سلطان نے کوئی ایسا حکم یا کام شیخ کے خلاف نہیں کیا جس سے یہ یقین کیا جاسکے کہ سلطان اور شیخ کے بیچ گہری رنجش چل رہی تھی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس بات کا ذکر شیخ کے ملفوظات نیز برنی اور امیر خسرو کی تحریر میں ضرور ملتا[41]۔

سلطان محمد بن تغلق (1351-1325ء) کا صوفیاء سے تعلق

دہلی سلطنت کے تمام سلطانوں میں محمد بن تغلق ایک مختلف مزاج کا حکمراں تھا۔ اس کا سیاسی منصوبہ اسلام کی کھوئی ہوئی یکجہتی کو متحد کرنے پر مرکوز تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی پُروقار زندگی اور ان کے اتحاد کو پھر سے واپس لایا جائے، جو خلفاء راشدین کے دور کا امتیاز تھا۔ اس نے خلفاء راشدین کے دور کی خوبیوں کو از سر نو بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کئی طرح کے راستے اختیار کیے لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے ناکام رہا۔ محمد بن تغلق کے عہدِ حکمرانی کے لوگوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور نہ اس کے اسلامی نظریے کو سمجھ سکے۔ نامساعد حالات اور لوگوں کے سلوک نے اس کے جذبات کو بھڑکا دیا، اسے چڑچڑا بنا دیا۔ انجام یہ ہوا کہ نہ وہ زمانے کو سمجھ پایا اور نہ زمانہ اس کو سمجھ سکا اور وہ تاریخ کے صفحہ پر دہلی سلطنت کے عہد کا ایک بدمزاج اور پاگل حکمراں کی حیثیت سے مشہور ہو کر رہ گیا۔

سلطان محمد بن تغلق نے دہلی کے تمام صوفیاء کو متحد کر کے اپنے خیالات کو ان سے ہم آہنگ رکھا اور کہا کہ تمام اسلامی مراکز ایک مرکز کی شکل میں ہو کر کام کریں اور اس مرکزی اتحاد کا کنٹرول خود سلطان کے ہاتھوں میں سونپ دیں۔ سلطان کے اس خیال کو تو سہروردی سلسلے کے صوفیاء نے

مان لیا اور سلطنت کے کاموں میں حمایت دینے لگے، لیکن چشتیہ سلسلے کے صوفیاء نے اسے قبول کرنے میں اپنی صوفیانہ آزادی میں خلل اور ولایت کی روایت پر رکاوٹ سمجھ کر مسترد کر دیا۔ انہوں نے سلطان اور سلطنت کی کسی بھی طرح کی مدد سے انکار کر دیا۔ انجام یہ ہوا کہ سلطان کے منصوبے اور چشتیہ صوفیاء کے خانقاہی منصوبے، دونوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ دہلی چشتی صوفیاء کا مرکز تھا، جو اپنی ترقی کی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔ سلطان سے ٹکراؤ کے سبب چرمرا کر رہ گئی[42]۔

ملتان میں سہروردیہ سلسلہ اور سلطان محمد بن تغلق

ملتان میں سہروردیہ سلسلے کی خانقاہیں بڑی تعداد میں موجود تھیں جو سلطان کی سیاسی مدد کا مرکز بنیں۔ محمد بن تغلق نے یہاں خانقاہوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر کے اپنے منصوبے کے مطابق کام کیا۔ اس نے شیخ رکن الدین ابوالفتح کو اپنی خانقاہ کو چلانے کے لئے سو گاؤں جاگیر کی شکل میں عطا کیا۔ جب ملتان کے حاکم کشلو خان نے بغاوت کی تو اس خانقاہ کے صوفیاء نے سلطان کا ساتھ دیا۔ یہاں تک کہ شیخ امام الدین کی موت اسی بغاوت میں ہوگئی۔ بغیر سلطان کے حکم کے اس خانقاہ میں کسی کو ٹھہرنے نہیں دیا جاتا تھا، لیکن ایسا حکم سلطان کی طرف سے نہیں تھا بلکہ سلطان کی وفاداری دکھانے کے لئے کچھ لوگوں نے ایسا کیا تھا[43]۔

سید جلال الدین بخاری اور سلطان محمد بن تغلق

اُچ کے مشہور صوفی سید جلال الدین بخاری جو پورے سندھ میں مخدوم جہانیاں کے نام سے مشہور تھے۔ سلطان محمد بن تغلق نے ان کو شیخ الاسلام کے خطاب سے سرفراز کیا اور جاگیر پیش کی لیکن مخدوم جہانیاں نے چالیس خانقاہ کی سربراہی اور ایک بڑی جاگیر اور اس کے ساتھ شیخ الاسلام کا خطاب پا کر خوش نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کہیں ہم میں تکبر اور انا کا اثر نہ پنپنے لگے، اس خوف سے وہ سیدھے مکہ مکرمہ حج کے لئے چلے گئے[44]۔

شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری اور سلطان محمد بن تغلق

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری فردوسیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہار منیر کے مشہور صوفی مانے جاتے تھے۔ سلطان ان کا بہت احترام کرتا تھا اور ان سے بیحد عقیدت رکھتا تھا۔ سلطان نے

خانقاہ کی تعمیر پتھروں سے کرنے اور اس کے نظم ونسق کے لئے ایک بڑی جاگیر دینے کا حکم جاری کیا۔ شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری نے سلطان کی نافرمانی سے بچنے کے لئے جاگیر کو قبول کرلی، لیکن فیروز شاہ تغلق کے مسند پر بیٹھتے ہی اس جاگیر کو واپس کر دیا۔ آج بھی سلطان کے ذریعہ تعمیر کردہ خانقاہ محفوظ ہے۔45

شیخ شرف الدین پانی پتی اور سلطان محمد بن تغلق

پانی پت کے مشہور صوفی شیخ شرف الدین پانی پتی سے بھی سلطان بہت عقیدت رکھتا تھا اور ان کا احترام بھی بہت کرتا تھا۔ ان کی عقیدت میں خط بھی لکھا کرتا تھا۔

چشتیہ سلسلہ اور سلطان محمد بن تغلق

چشتی صوفیاء سلطان کے مذہبی منصوبے کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے اور اپنی بنیادی روایت کو قائم رکھنے کے لئے سلطان سے ٹکرا گئے۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی مولانا فخر الدین زرادی اور شیخ قطب الدین منور شیخ نظام الدین اولیاء کے ان خلفاؤں میں سے تھے، جو اپنے شیخ کے دستور اور ان کی تعلیم پر پابندی کے ساتھ قائم رہے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ انہیں سلطان کی سخت انتقامی کاروائیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان بزرگوں نے بھی بڑے ہی تحمل اور صبر سے کام لیا۔ اپنے شیخ کے ذریعہ دی گئی تعلیم کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان تمام مصیبتوں اور اذیتوں کو برداشت کرتے چلے گئے۔ ان صوفیاء کے علاوہ شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدین خانقاہوں سے نکل کر سیاسی کاموں میں شریک ہوگئے۔ شیخ بابا فرید گنج شکر کی اولاد شیخ نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں سے تھے۔ سبھی سلطنت کے کاموں سے جڑ گئے۔ جن میں خواجہ کریم الدین سمرقندی، سید قطب الدین حسین کرمانی، سید کمال الدین، شیخ مظہر الدین، شیخ معز الدین اور شیخ علیم الدین قابل ذکر ہیں۔ اگر یہ صوفی سلطنت کے کاموں سے نہیں جڑے ہوتے تو چشتیہ سلسلے کا خاتمہ اتنی آسانی سے نہیں ہوا ہوتا۔46

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی اور سلطان محمد بن تغلق

دیوگیر جانے سے پہلے سلطان نے علماء اور صوفیاء کو دربار میں بلایا تھا۔ ان میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی بھی گئے تھے۔ سلطان نے تمام علماء اور صوفیاء کو دہلی چھوڑ کر دیوگیر میں

مذہب کا کام کرنے کا حکم دیا۔ شیخ نصیرالدین چراغِ دہلی نے شاید دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا اور اس حکم کے نہ ماننے کی وجہ سے سلطان اور شیخ کے درمیان من مٹاؤ پیدا ہو گیا۔[47]

سلطان کے غصے اور دربار میں قتل کے چرچے دہلی میں ہونے لگے تھے۔ ان چرچوں کی وجہ سے دہلی میں رہنے والے اس وقت کے اور بعد کے مغل مؤرخوں نے محمد بن تغلق اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے تعلق کے سلسلے میں ایسی ایسی باتیں گڑھ ڈالیں جو سچائی سے بہت دور ہیں[48]۔ جیسا کہ مغل مورخین مولانا عبدالواحد نے ''سبع سنابل'' میں لکھا ہے۔ نیز ''فرشتہ'' بھی اس کی حمایت کر رہا ہے کہ محمد بن تغلق نے شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کو جسمانی اذیت دی تھی۔ ایک بار جب سلطان نے شیخ کو شاہی کپڑا پہنانے کا کام سونپا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ سلطان نے غصے میں آ کر، ان کے گلے کی ہڈی میں سوراخ کروا کر، اس میں دھاگہ باندھ کر پیڑ کے اوپر بندھوا دیا۔ اس جسمانی تکلیف سے پریشان ہو کر شیخ نے سلطان کو کپڑا پہنانے کی خدمت قبول کر لی[49]۔ اس طرح کی کئی جسمانی اذیتوں کا تذکرہ الگ الگ مقام پر کیا گیا ہے۔ لیکن اس بات کا ذکر شیخ کے ملفوظ میں اور ضیاءالدین برنی جو سلطان کے دربار میں بیٹھ کر واقعات کو لکھا کرتا تھا، اپنی تحریر میں اس طرح کے واقعہ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔

سلطان محمد بن تغلق نے علماء اور صوفیاء کو سلطنت کے کسی نہ کسی کاموں سے جڑنے کے لئے مجبور کر دیا تھا، جو چشتی صوفیاء کے لئے اپنی روایت کے خلاف کام تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو سلطان کے اس سلوک نے ذہنی طور سے تکلیف پہنچائی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی تحقیق کی بنیاد پہ ابن بطوطہ کی تحریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن بطوطہ نے یہ لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق جب مسند پر بیٹھا تو اس نے علماء اور صوفیاء کو اپنی سلطنت کے کاموں سے جوڑ کر کام کرنے کا طریقہ اپنایا اور وہ یہ مثال دیتا تھا کہ خلفاء راشدین اپنے سلطنت کے کاموں کو تعلیم یافتہ اور دانشوروں کے علاوہ کسی کو نہیں سونپتے تھے[50]۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ محمد بن تغلق علماء اور صوفیاء سے وہی خدمت لینا چاہتا تھا جو خلفاء راشدین نے تعلیم یافتہ اور دانشوروں سے لیا تھا اور یہ خدمت سلطنت کی نوکری تھی، جس کو بعد کے فارسی مورخین نے سلطان کے کپڑا اور پگڑی پہنانے کی خدمت سے جوڑ کر سلطان پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے[51]۔

شیخ فخر الدین زرادی اور سلطان محمد بن تغلق

شیخ فخر الدین زرادی، شیخ نظام الدین اولیاء کے عزیز خلفاء میں سے ایک تھے۔ سلطان نے انہیں دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا[52]۔ وہ اپنے شاگرد قطب الدین دبیر کے ساتھ سلطان کے سامنے حاضر ہوئے۔ سلطان نے چاندی اور سونے کے برتن میں کھانا پیش کیا، تاکہ وہ اسے کھانہ سکیں اور وہ ان کو رسوا کر سکے۔ لیکن شیخ نے روٹی اور سالن اپنے ہاتھ میں اٹھا کر نہ چاہتے ہوئے بھی کھالیا۔ سلطان کو جب رسوا کرنے کا موقع نہیں ملا تو انہیں جاتے وقت ایک اون کا کپڑا اور ایک روپے کی تھیلی پیش کی۔ شیخ قبول کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن ان کے شاگرد قطب الدین دبیر نے آگے بڑھ کر تھیلی اور کپڑا اپنے ہاتھوں میں لے لیا، تاکہ سلطان کو کوئی موقع نہ مل سکے۔ بعد میں شیخ کو دیوگیر جانے کا حکم دیا۔ شیخ نے دیوگیر جاکر آزادی سے اپنا کام انجام دیا۔ شیخ کو اپنے اصول ودستور کو برقرار رکھنے میں سلطان کی طرف سے کسی طرح کی پابندی نہیں تھی۔ وہ سماع کا انعقاد آزادانہ طور سے کیا کرتے تھے[53]۔

شیخ قطب الدین منور اور سلطان محمد بن تغلق

شیخ قطب الدین منور شیخ جمال الدین ہانسوی کے پوتے اور شیخ نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ان کی خانقاہ ہانسی میں تھی۔ ایک مرتبہ سلطان محمد بن تغلق نے دو گاؤں کا فرمان قاضی کمال الدین صدر جہاں کے ذریعہ بھیجا، تو شیخ نے اسے لینے سے انکار کر دیا[54]۔ سلطان نے انہیں دہلی دربار میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ شیخ دہلی دربار میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے دادا کے مزار پر گئے اور کہا کہ میں سلطان کے دربار میں اپنی خواہش سے نہیں، بلکہ سلطان کے خادم کے ساتھ سلطان کی خواہش کے مطابق حاضری دینے جا رہا ہوں۔ شیخ دہلی آئے اور فیروز شاہ تغلق سے ملاقات کی، اور کہا کہ سلطان کے سامنے کس طرح پیش ہونا چاہیے؟ تم بتاؤ، جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گا۔ فیروز شاہ تغلق نے کہا سلطان سے نرمی کے ساتھ بات کیجیے گا۔ شیخ دربار میں حاضر ہوئے۔ سلطان نے پوچھا کہ میں جب ہانسی پہنچا تو آپ ہم سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ شیخ نے جواب دیا میں اس پوزیشن میں نہیں تھا، ایک کونے میں بادشاہ اور اس کی سلطنت کے لئے دعا میں مشغول تھا۔ یہ جواب سن کر سلطان بہت خوش ہوا۔ سلطان محمد بن تغلق نے فیروز اور ضیاء الدین برنی کو ایک لاکھ تنکا (اس دور کی کرنسی) دے کر شیخ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے

بھیجا۔ بڑی گزارش کے بعد شیخ نے صرف دو ہزار تنکے قبول کیے [55]۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (1351-1388ء) کا صوفیاء سے تعلق

محمد بن تغلق کی پالیسیوں کی وجہ سے خانقاہی نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ اسے فیروز شاہ تغلق کے دور میں پھر سے از سر نو قائم کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ فیروز شاہ تغلق کے تعلقات صوفیاء سے شروع سے ہی اچھے تھے۔ محمد بن تغلق کی موت کے بعد فیروز شاہ تغلق کو مسند پر بٹھانے میں دہلی کے علماء اور مشائخ نے کھل کر حصہ لیا۔ خاص طور پر شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی دعاؤں اور کوششوں سے اسے مسند حاصل ہوئی تھی، جس کا اثر فیروز شاہ تغلق پر یقینی طور سے پڑا۔ مسند پر بیٹھنے کے ساتھ ہی اس نے خانقاہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے میں دل کھول کر مدد کی۔

ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ سلطان فیروز شاہ نے شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، شیخ رکن الدین ابوالفتح اور شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ جمال الدین کی خانقاہ، جو گاؤں میں دور دور تک قائم تھیں، جہاں افسردگی کا ماحول چھایا ہوا تھا، اب از سر نو وہاں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی۔ برسوں سے گاؤں، علاقے میں خانقاہیں بند پڑی تھیں۔ جہاں پرندے کو دانا اور پانی بھی نہیں مل پاتا تھا اب وہاں صوفیاء، فقیروں اور قلندروں کی بھیڑ اور لنگر چلنے لگے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق فقیروں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان سے ملنا اور ان کی مدد کرنا اس کی تسکین روح کا ذریعہ بن چکا تھا [56]۔

شیخ نصیر الدین محمود چراغ، دھلی اور فیروز شاہ تغلق

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی نے فیروز شاہ تغلق کے سلطان بنتے ہی اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا [57]۔ وہ کبھی بھی سلطان سے ملنے دربار میں نہیں گئے اور نہ اس کے ذریعہ دی گئی جاگیر کو قبول کیا۔ وہ سلطنت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ برنی نے علماء اور صوفیاء کو جنہیں سلطان کی طرف سے جاگیر دی گئی تھی، ایک فہرست پیش کی ہے۔ اس میں شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا نام نہیں ہے [58]۔

''جوامع الکلم'' میں ایک جگہ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک مرتبہ فیروز شاہ تغلق شیخ نصیر الدین چراغ دہلی سے ملنے ان کی خانقاہ میں آیا تو اس وقت شیخ آرام کر رہے تھے۔ شیخ کے خادم مولانا زین الدین نے اس بات کی اطلاع شیخ کو دی، تو شیخ اپنے حجرے سے نکل کر وضو خانہ کی طرف چلے گئے

اور وضو کیا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ فیروز شاہ تغلق نے کافی انتظار کیا اور کہنے لگا "ہم بادشاہ نہیں ہیں، بادشاہ تو یہ ہیں"۔ کافی دیر بعد شیخ حجرے سے باہر آئے اور خانقاہ کی آنگن میں ہی چٹائی بچھا کر وہیں پر بات کی۔ فیروز شاہ نے تھوڑی دیر باتیں کی اور ان کے اس سلوک سے ناراض ہو کر لوٹ گیا۔ اس واقعہ سے پختہ ہو جاتا ہے کہ چراغ دہلی سلطان سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

شیخ نور الدین اور سلطان فیروز شاہ تغلق

شیخ قطب الدین منور چشتیہ سلسلے کے ان صوفیاء میں سے تھے جو خانقاہی زندگی میں سلطنت کی مداخلت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ممکنہ حد تک اپنی خانقاہ کو سلطان اور سلطنت سے الگ تھلگ رکھا۔ شیخ رکن الدین جو قطب الدین منور کے بیٹے تھے، فیروز شاہ تغلق ان سے ملنے کے لئے ہانسی گیا، شیخ نے کھڑے ہو کر سلطان کا استقبال کیا۔ سلطان نے شیخ کو حصار فیروز شاہ میں آنے کی گزارش کی[59]۔ شیخ نے پوچھا کہ اس بات کا فیصلہ لینے کا اختیار ہمیں ہے یا نہیں۔ سلطان نے کہا ہم آپ کو حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ آپ چاہیں رہیں، چاہیں نہ رہیں۔ شیخ نے کہا مجھے ہانسی میں ہی رہنا ہے، یہ میرے باپ دادا کا وطن ہے۔ شیخ فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء نے اس جگہ کو ہمیں سونپا ہے[60]۔

شیخ شرف الدین پانی پتی اور سلطان فیروز شاہ تغلق

شیخ شرف الدین پانی پتی، سلطان فیروز شاہ تغلق سے بہت محبت کرتے تھے۔ جب بھی میٹھی کھیر پکاتے تھے تو بچے ہوئے کھانے کو اپنے خادم کو دے کر کہتے تھے اسے میرے بیٹے فیروز کے لئے لے جاؤ[61]۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور سلطان فیروز شاہ تغلق

مخدوم جہانیاں جہاں گشت جب حجاز کے سفر سے واپس آئے تو سلطان محمد بن تغلق کی وفات ہو چکی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد ان کا تعلق فیروز شاہ تغلق سے استوار ہو گیا۔ مورخ شمس سراج عفیف کے مطابق سلطان اور مخدوم جہانیاں کا تعلق والہانہ تھا۔ فیروز شاہ تغلق جب بھی دہلی آتے تھے، وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ انکا استقبال کرتا تھا۔ زندگی کی آخری ملاقات میں تو

وہ شاہی مہمان کے طور پر فیروز آباد کے محل میں ٹھہرے تھے۔ شیخ کی ہر ہر باتیں نوٹ کی جاتی تھیں۔ شیخ ضرورت مندوں کے لئے مدد کی لسٹ لے کر آتے تھے، اور سلطان ان ضرورت مندوں (غریبوں) کو اپنے خزانے سے مدد کرتا تھا[62]۔ سندھ میں مخدوم جہانیاں کا بہت اثر تھا۔ سلطان نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا، سندھ میں جو سلطان کے خلاف سازش رچی جا رہی تھی، اس کو شیخ نے مخالفین اور سلطان کے درمیان صلح کرا کر معاملے کو ختم کرا دیا۔

شیخ جمال الدین اور سلطان فیروز شاہ تغلق

ایک بار جب سلطان فیروز شاہ تغلق سندھ گیا تو وہاں سے اُرچ پہنچا اور وہاں شیخ جمال الدین کی خانقاہ کو از سر نو تعمیر کرنے کے لئے ان کے بیٹوں کو گاؤں اور باغ کا فرمان جاری کیا[63]

(تاریخ فیروز شاہ، برنی صفحہ 538-539)

شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری اور احمد بہاری اور سلطان فیروز شاہ تغلق

شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے تعلقات سلطان سے کافی اچھے تھے، لیکن محمد بن تغلق کے ذریعہ حاصل شدہ جاگیر کو یحیٰ منیری نے فیروز شاہ کو لوٹا دیا تھا۔ وہ اپنی خانقاہ کو سلطنت کی طرف سے حاصل کی گئی مدد اور جاگیر سے الگ رکھنا چاہتے تھے[64] احمد بہاری، یحیٰ منیری کے اچھے دوست تھے، جن کی سوچ گہری اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔ جب احمد بہاری دہلی آئے اور کچھ دن ٹھہرے تو لوگوں نے سلطان سے شکایت کی کہ دہلی میں احمد بہاری نام کے صوفی ''انا الحق'' یعنی اپنے کو خدا سمجھتے ہیں۔ فیروز شاہ تغلق ان کے عقیدے، وحدۃ الوجود کی گہرائیوں کو سمجھ نہیں سکا، انجام یہ ہوا کہ علماء نے ان کے خلاف قتل کا فتویٰ جاری کر دیا لہٰذا انہیں قتل کر دیا گیا۔ جب یہ بات شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کو معلوم ہوئی تو ان کے قتل کے بارے میں سن کر ان کو دلی صدمہ پہنچا اور انہوں نے ایسی سلطنت کو برباد ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق کے بعد دہلی پر تیمور کا حملہ ہوا اور تغلق خاندان کی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی[65]۔

سلطان بہلول لودی (1451-1488ء) کا صوفیاء سے تعلق

سلطان بہلول لودی بچپن سے ہی مذہبی خیال کا آدمی تھا۔ 'تاریخِ داؤدی' اور 'طبقاتِ اکبری' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ گھوڑوں کی تجارت کر رہا تھا تو راستے میں ایک مجذوب فقیر سے ملاقات ہوئی۔ جن کا نام سید ابن تھا۔ انہوں نے ابن بہلول اور اس کے ساتھیوں کو بلایا اور کہا کہ دو ہزار تنکے میں ہندوستان کی بادشاہت کون خریدنے کو تیار ہے۔ سبھی چپ رہے لیکن بہلول نے سولہ سو تنکے نکال کر اس مجذوب کے سامنے رکھ دیا۔ مجذوب نے اس تنکے کو قبول کرتے ہوئے کہا تمہیں دہلی کی بادشاہت مبارک ہو۔ یہ آدمی جو تیرے ساتھ ہیں، تیرے یہاں نوکری کرینگے۔ جب اس کے ساتھیوں نے بہلول کا مذاق اڑایا تو اس نے کہا، اگر اس مجذوب کی بات سچ نہیں ہوئی تو ہمیں ایک سیّد کی مدد کرنے کا اجر تو ضرور ملے گا[66]۔ لیکن اس مجذوب کی بات سچ ثابت ہوئی۔ ایک دن بہلول لودی دہلی کا سلطان بنا اور 1451-1488 عیسوی تک حکومت کی۔

شیخ سماء الدین اور سلطان بہلول لودی

سلطان بہلول لودی کا پنجاب اور ملتان کے سہروردی صوفیاء سے بڑے ہی اچھے تعلقات تھے۔ شیخ سماء الدین سہروردی اس کے دور کے مشہور صوفی تھے، جو ملتان سے دہلی چلے آئے تھے اور یہیں اپنی خانقاہ قائم کر لی تھی۔ وہ سلطنت سے الگ تھلگ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن سلطان بہلول لودی کی عنایتیں اور اچھے سلوک نے انہیں بہت قریب کر دیا[67] ایک بار سلطان ان کی خانقاہ میں پہنچا اور ان کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگا کہ میں آپ کی مہربانی چاہتا ہوں۔ شیخ نے اسے بہت ساری نصیحتیں کیں۔ ان کی نصیحتوں کو سن کر سلطان رونے لگا، اور کہنے لگا کہ ہمیں فقیروں سے بڑی ہمدردی اور محبت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجھے خدا ان محبتوں کے عوض میں نجات عطا کرے گا۔ سلطان کی اس محبت اور عقیدت کو دیکھ کر شیخ نے اسے ایک مصلّٰی دیا جسے وہ اپنے سر پر رکھ کر خانقاہ سے واپس ہوا[68]۔

جب بہلول لودی کی وفات ہوئی تو ایک دن شیخ سماء الدین اس کی قبر پر آئے اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ اس آدمی نے اپنی عمر کو سلطانی میں گزارا ہے، لیکن اس کی فقیروں سے محبت اور

عقیدت کے سبب، وہ خدا سے جو چاہتا تھا، اسے وہی مل گیا۔ اس نے آخرت کی دنیا میں بھی اعلیٰ مقام پایا[69]۔

سلطان سکندر لودی (1488-1517ء) کا صوفیاء سے تعلق

سلطان سکندر لودی کے دور میں علماء اور صوفیاء نے آزادانہ طریقے سے مذہبی کاموں کو فروغ دیا۔ سلطان سکندر لودی کے دور میں تصوف اور مذہبی امور کے فروغ کے مواقع ملے نیز انہیں پھلنے پھولنے کا پورا ماحول بھی حاصل ہوا۔ حالانکہ اس کی وجہ سے حقیقی اسلامی روح کو نقصان بھی پہنچا۔ جادو، ٹونا، دعا، تعویذ کے رسوم بڑھ گئے۔

بہار کے صوفیاء اور سلطان سکندر لودی

سلطان سکندر لودی بہار میں موجودگی کے دوران وہاں کے علماء اور صوفیاء سے ملنے انکے گھر جایا کرتا تھا۔ بہار کے مشہور صوفی شیخ فخرالدین زاہدی تھے۔ بنگال کا حکمراں ان کا مرید تھا۔ بہار میں ان کا بہت اثر تھا۔ ان کے پاس جو بھی جاتا تھا اسے میٹھا شربت پلاتے تھے۔ جب سلطان سکندر لودی ان سے ملنے گیا، تو اسے بڑے ہی احترام سے بیٹھایا اور اسے شربت پلایا۔ جب سلطان جانے لگا تو شیخ نے اپنے خادم کو باہر تک چھوڑنے کے لئے سلطان کے ساتھ بھیجا[70]۔

جب سکندر لودی بہار سے کوچ کرنے لگا تو وہاں کے علماء اور صوفیاء کو خاص طور سے شیخ بدیع حقانی، شیخ منیری، شیخ بداطیب، شیخ فخرالدین جیسے صوفیاء کو نذرانہ پیش کیا[71]۔

مولانا شیخ جمالی اور سلطان سکندر لودی

مولانا جمالی، شیخ سماءالدین دہلوی کے مرید تھے اور سلطان سکندر لودی کے دور کے مشہور اور سلطان کے سب سے قریبی صوفی تھے۔ سلطان سکندر لودی انہیں بہت پیار اور محبت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان سکندر لودی نے کسی بات پر میاں حافظ کے سلسلے میں کچھ کہہ دیا، جس سے مولانا جمالی کو دلی صدمہ پہنچا اور وہ ہندوستان چھوڑ کر خراسان کی طرف چل پڑے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ عراق، عرب، شام، مصر سے سفر کرتے ہوئے جب دہلی پہنچے تو اس وقت سلطان سکندر

لودی بدایون میں تھا۔ جب سلطان سکندر لودی کو یہ پتہ چلا تو اس نے ایک خط مولانا جمالی اور ایک خط شیخ سماء الدین کو لکھا کہ جمالی کو جلد سے جلد بدایوں بھیج دیں۔ شیخ سماع الدین نے اپنے مرید مولانا جمالی کو سمجھا کر سلطان کے پاس بھیج دیا اور پھر مولانا جمالی سلطان سکندر لودی کے قریبی بن گئے۔ جب سلطان سکندر لودی کی موت ہوئی تو مولانا جمالی کو دلی صدمہ پہنچا[72]۔

سلطان ابراہیم لودی (1517-1526ء) کا صوفیاء سے تعلق

سلطان ابراہیم لودی کے دورِ عہد کے مشہور صوفی مولانا جمالی، میاں بہوا اور اعظم ہمایون تھے۔ جن سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بھائی جلال خان اس سے شکست کھا کر شیخ عبدالوہاب بخاری کی خانقاہ میں پناہ لے لی تھی، جس کی وجہ سے شیخ عبدالوہاب بخاری سے بھی سلطان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ اس کا بھائی کلال خاں شیخ سے بیعت ہو چکا تھا۔ سلطان ابراہیم لودی نے اپنے بھائی جلال خاں کو ہانسی بھیجنے کے بہانے شیخ کی خانقاہ سے بلایا اور راستہ میں ہی اسے مروادیا۔ اس حادثے سے شیخ عبدالوہاب بخاری کو دلی صدمہ پہنچا۔ جب پانی پت کی جنگ شروع ہوئی تو شیخ بار بار ابراہیم کے بارے میں پوچھتے تھے اور کہتے تھے "حضرت رسول اکرمؐ نے، اس کا سر کاٹ کر میرے ہاتھ میں دے دیا ہے"۔ اس طرح سلطان ابراہیم لودی پانی پت کی جنگ میں شکست کھا کر شہید ہو گیا[73]۔

حوالہ جات

1. خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، (اردو)، دہلی، (1981)، صفحہ نمبر 117
2. ایضاً، صفحہ نمبر 119-120
3. ایضاً، صفحہ نمبر 121
4. ایضاً، صفحہ نمبر 121
5. ایضاً، صفحہ نمبر 138
6. ایضاً، صفحہ نمبر 149
7. ایضاً، صفحہ نمبر 162
8. ایضاً، صفحہ نمبر 164
9. ایضاً، صفحہ نمبر 167
10. ایضاً، صفحہ نمبر 166
11. ایضاً، صفحہ نمبر 166-167
12. ایضاً، صفحہ نمبر 207-209
13. ایضاً، صفحہ نمبر 212
14. ایضاً، صفحہ نمبر 271
15. ایضاً، صفحہ نمبر 272
16. ایضاً، صفحہ نمبر 273
17. ایضاً، صفحہ نمبر 274
18. ایضاً، صفحہ نمبر 276
19. ایضاً، صفحہ نمبر 290
20. ایضاً، صفحہ نمبر 291
21. ایضاً، صفحہ نمبر 292
22. ایضاً، صفحہ نمبر 292
23. ایضاً، صفحہ نمبر 293
24. ایضاً، صفحہ نمبر 293
25. ایضاً، صفحہ نمبر 293
26. ایضاً، صفحہ نمبر 294
27. ایضاً، صفحہ نمبر 295

28. ایضاً، صفحہ نمبر 295-296
29. ایضاً، صفحہ نمبر 314
30. ایضاً، صفحہ نمبر 318
31. ایضاً، صفحہ نمبر 318
32. ایضاً، صفحہ نمبر 319
33. ایضاً، صفحہ نمبر 319
34. ایضاً، صفحہ نمبر 309
35. ایضاً، صفحہ نمبر 304
36. ایضاً، صفحہ نمبر 307
37. ایضاً، صفحہ نمبر 314
38. ایضاً، صفحہ نمبر 315
39. ایضاً، صفحہ نمبر 316
40. ایضاً، صفحہ نمبر 317
41. ایضاً، صفحہ نمبر 317
42. ایضاً، صفحہ نمبر 354
43. ایضاً، صفحہ نمبر 355
44. ایضاً، صفحہ نمبر 359
45. ایضاً، صفحہ نمبر 372
46. ایضاً، صفحہ نمبر 359
47. ایضاً، صفحہ نمبر 362-363
48. ایضاً، صفحہ نمبر 365
49. ایضاً، صفحہ نمبر 364
50. ایضاً، صفحہ نمبر 366
51. ایضاً، صفحہ نمبر 368
52. ایضاً، صفحہ نمبر 369
53. ایضاً، صفحہ نمبر 370
54. ایضاً، صفحہ نمبر 371
55. ایضاً، صفحہ نمبر 403
56. ایضاً، صفحہ نمبر 403

— — —

57. ایضاً، صفحہ نمبر 410
58. ایضاً، صفحہ نمبر 410
59. ایضاً، صفحہ نمبر 411
60. ایضاً، صفحہ نمبر 412
61. ایضاً، صفحہ نمبر 411
62. ایضاً، صفحہ نمبر 414
63. ایضاً، صفحہ نمبر 415
64. ایضاً، صفحہ نمبر 412
65. ایضاً، صفحہ نمبر 425
66. ایضاً، صفحہ نمبر 441
67. ایضاً، صفحہ نمبر 444
68. ایضاً، صفحہ نمبر 445
69. ایضاً، صفحہ نمبر 456
70. ایضاً، صفحہ نمبر 457
71. ایضاً، صفحہ نمبر 463-464
72. ایضاً، صفحہ نمبر 471-472

☆☆☆

چھٹا باب

مغل بادشاہوں کا صوفیاء سے تعلق

مغل بادشاہ اکبر (1556-1605ء) اور صوفیاء

شیخ سلیم چشتی اور اکبر

اکبر کو شیخ سلیم چشتی سے گہرا تعلق تھا۔ ان کی دعاؤں سے اس کا بیٹا سلیم (جہانگیر) پیدا ہوا تھا۔ اکبر شیخ سلیم چشتی سے ملنے گیا اور ان سے بیٹا پانے کے لئے خدا سے دعائیں کرنے کی گزارش کی۔ شیخ سلیم چشتی نے کہا کہ تمہارے نصیب میں اولاد نہیں ہے۔ اکبر نے کہا "اگر میرے نصیب میں اولاد ہوتی تو میں آپ سے دعاؤں کی درخواست کے لئے کیوں آتا"۔ کچھ سوچ کر شیخ نے کہا، اپنی بیوی کو میرے گھر بھیج دینا۔ اکبر نے اپنی بیوی کو شیخ کے گھر بھیج دیا۔ اس کی بیوی کو اپنے گھر آنے کی خبر پاتے ہی شیخ گھر آئے اور اپنی بیوی سے کہا "تم رانی صاحبہ کے ساتھ پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھ جاؤ اور اپنی چادر سے دونوں اپنے جسم کو ڈھک لو"۔ ان کی بیوی نے رانی صاحبہ کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ شیخ نے اپنی بیوی سے کہا "تم اپنے بچے کو رانی صاحبہ کو دے دو"۔ اس کے بعد رانی صاحبہ اپنے محل لوٹ گئیں۔ کچھ دنوں کے بعد اکبر شیخ سے ملنے آیا تو شیخ نے اکبر سے کہا تمہیں اولاد مبارک ہو۔ اس کا نام میرے نام پر رکھنا۔ کچھ ہی دنوں بعد سلیم (جہانگیر) پیدا ہوا۔ بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں اکبر نے تین لاکھ بیگھہ زمین اور تین سو گاؤں اور بہت سارے

سونا، چاندی اور مال خیرات کیا۔

ایک دن اکبر نے فتح پور سیکری کے شاہی محل کو دیکھنے کے لئے شیخ کو بلایا۔ شیخ نے ان محلوں کو دیکھ کر کہا جو نقشہ میرے دل میں ہے، اس طرح کی ایک بھی عمارت تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ اکبر نے فوراً نقشہ بنانے والے کو بلایا اور شیخ کے دل میں جو نقشہ تھا اس نقشے کے مطابق نیا نقشہ بنا کر لانے کو کہا۔ جب نقشہ بن کر تیار ہو گیا تو اکبر نے اسی نقشے کے مطابق عمارت تعمیر کرانے کا منصوبہ بنا ڈالا۔ اس نقشے کے مطابق مسجد اور اس کے ساتھ خانقاہ کی تعمیر کی گئی۔ اس خانقاہ اور مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک بڑا بلند دروازہ بھی بنایا گیا۔ یہ مسجد اور خانقاہ کی تعمیر، اکبر نے اپنے انتظامی امور سے ہٹ کر نہیں، بلکہ اپنے انتظامی امور کے جزو کے طور پر اپنے محل اور دیوان عام کے ساتھ ہی تعمیر کروایا۔ اکبر شیخ سلیم چشتی سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اپنے بیٹے جہانگیر کو تعلیم اور تربیت کے لئے شیخ کی سرپرستی میں دے دیا[1]۔

مجدد الف ثانی اور اکبر

مجدد الف ثانی خواجہ باقی باللہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اکبر کے دورِ اقتدار میں ہندوؤں کی عزت افزائی اور علماء کی توہین نیز دینِ الٰہی جیسے منصوبے سے مجدد الف ثانی کافی پریشان تھے۔ ایک مرتبہ الف ثانی نے اکبر کے پاس اپنا پیغام بھیجا کہ ایک دن تمہاری طاقت اور سلطنت سب کی سب ختم ہو جائے گی، دنیا کی تمام چیزیں ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گی۔ وہ اپنی حرکتوں سے باز آئے، ورنہ اللہ کے غضب کا انتظار کرے۔ الف ثانی کے اس پیغام کا اثر اکبر پر بالکل بھی نہیں پڑا۔ اکبر نے اپنے دینِ الٰہی کی نمائش کے لئے ایک بڑے مجمع کا انعقاد کیا، جس میں الف ثانی بھی پہنچے۔ الف ثانی کا دل بہت بے چین تھا۔ اتنے میں آندھی آئی اور اکبر کے سارے خیمے گر پڑے اور اکبر اپنے منصوبے میں ناکام رہا[2]۔

شیخ محمد غوث گوالیاری اور اکبر

شیخ محمد غوث گوالیاری کا تعلق مغلوں سے ابتداء سے ہی خوشگوار تھا۔ بابر اور ہمایوں سے بھی اچھے بنتے تھے۔ شیر شاہ کے دور میں شیخ محمد غوث گوالیار چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ اکبر کے دور میں، اکبر کے دربار کے قاضی شیخ گدائی، شیخ محمد غوث گوالیار کا مخالف تھے۔ شیخ محمد غوث گوالیار

نے اپنی تحریر ''معراج'' میں معراج کے بارے میں لکھا تھا، جس پر علماء نے اعتراض کیا اور ایک مناظرے میں شیخ محمد غوث سے اس کو ثابت کرنے کو کہا گیا۔ شیخ محمد غوث علماء کی اس پالیسی سے دل برداشتہ ہوکر آگرہ سے گوالیار چلے گئے۔ اکبر کے دربار میں انہیں عزت نہ مل سکی، لیکن مغلوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہونے کے سبب اکبر نے انہیں نذرانے کے طور پر کچھ پیسے پیش کئے، جس سے شیخ محمد غوث نے گوالیار میں ایک عظیم الشان خانقاہ کی تعمیر کرائی[3]۔

مغل بادشاہ جہانگیر (1605-1627ء) اور صوفیاء

مجدد الف ثانی اور جہانگیر

جہانگیر کے دور حکومت میں، اکبر کے زمانے میں پھیلی برائیوں کو ختم کرنے کے لئے، الف ثانی نے بہت کوششیں کی۔ الف ثانی نے جہانگیر کو شریعت کے خلاف کاموں کے خاتمے کے لئے متعدد خط لکھے۔ الف ثانی کی مقبولیت اور ان کے تعلقات کی وجہ سے علماء ان سے خلش کرنے لگے اور ان کے خلاف طرح طرح کے منصوبے بنا کر، ان کو بدنام کرنے کی کوشش شروع کردی۔

الف ثانی کے مکتوبات (ان کی تحریریں) جو دو حصوں میں چھپ چکی تھی، جس کی مقبولیت بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے چھپے مکتوبات میں تحریف کی گئی اور بہت ساری اضافی باتیں اس میں شامل کرکے ازسرنو چھپوایا گیا اور اس وقت کے بادشاہ جہانگیر کے سامنے پیش کرکے الف ثانی کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مکتوبات میں ایسی ایسی غیر مناسب باتیں لکھی گئیں تھیں کہ اسے پڑھ کر اچھے اچھے علماء اور صوفیاء الف ثانی کے خلاف ہوتے چلے گئے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی الف ثانی کی تحریر کے خلاف لکھا۔ الف ثانی کو بادشاہ جہانگیر نے دربار میں حاضر ہونے کا حکم جاری کیا۔ الف ثانی دربار میں حاضر ہوئے اور اپنے مکتوبات جو ان کے تھے اسے پیش کیا اور اس کی وضاحت کی۔ جہانگیر علماء کی سازش کو سمجھ گیا اور مطمئن ہوگیا۔

مخالفین کو جب اس میں کامیابی نہیں ملی تو الف ثانی کے خلاف جہانگیر کے دل میں سلطنت سے متعلق سیاسی خطرے جیسے بھرم پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ جہانگیر کے دل میں یہ خوف پیدا کیا گیا کہ الف ثانی نے بادشاہ کو سجدہ کئے جانے کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے اور وہ لوگوں کو بادشاہ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ انکے مرید اُمراء کے پاس ایک لاکھ گھڑسوار کی فوج بھی ہے اور

وہ کبھی بھی بادشاہ کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ اس بات سے جہانگیر بہت فکر مند ہوا اور اس نے دربار کے سارے امراء و عمائدین اور وزراء کو اکٹھا کیا اور الف ثانی کے سلسلے میں ایک میٹنگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلے میں آصف جاہ نے یہ مشورہ دیا کہ سب سے پہلے الف ثانی کے ساتھ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے انکے مریدوں اور عقیدت مندوں کو دور دور جگہوں پر بھیج دیا جائے تبھی ان کے خلاف کوئی بھی کارروائی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس مشورے کے مطابق عبد الرحیم خان خاناں کو دکن، سید صدر جہاں کو مغربی ملک، خان جہاں لودی کو مالوا اور محابت خان کو کابل بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد الف ثانی کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا اور حاضر ہونے پر بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کو کہا گیا۔ لیکن الف ثانی نے بادشاہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ کے حکم کو ٹھکرانے اور بادشاہ کو عزت نہ دینے کے الزام میں دربار کے علماء اور امراء نے الف ثانی کو سزائے موت کا فتویٰ سنا دیا۔ لیکن جہانگیر نے سزائے موت کے فتوے کو قید میں بدل کر انہیں گوالیار کی جیل میں قید کرا دیا۔ جب الف ثانی کے قید کیے جانے کی خبر خان خاناں، سید صدر جہاں اور اسلام خان، مرتضےٰ خان اور خان جہاں لودی اور سکندر خان، حیات خان اور محابت خان کو ملی، تو انہوں نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی۔ محابت خان نے تو سکے پر سے بادشاہ کا نام بھی ہٹوا دیا۔ جہانگیر اور محابت خان کے بیچ جنگ چھڑ گئی۔ محابت خان نے آصف جاہ اور نور جہاں کو قید کر لیا۔ الف ثانی کو جب بادشاہ کے خلاف جنگ کی خبر ملی تو انہوں نے جیل سے ایک خط لکھا کہ تم لوگ بغاوت مت کرو۔ اس کام سے ہمارے سارے منصوبے ختم ہو جائیں گے۔ تم لوگ فوری طور پر بغاوت ختم کر کے اپنے بادشاہ کے حکم کو قبول کرو۔ میں جلد ہی جیل سے باہر آ جاؤں گا۔ الف ثانی کے خط کو پڑھتے ہی محابت خان نے جہانگیر کو تخت پر بیٹھا کر اس کے تمام حکموں کو قبول کرتے ہوئے سجدہ عقیدت کیا۔ جہانگیر کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوا اور فوراً الف ثانی کو جیل سے باہر نکالا[4]۔

شاہ جہاں (1627-1658ء) اور صوفیاء

مولانا شہباز بھاگل پوری اور شاہ جہاں

جس وقت شاہ جہاں شاہزادہ تھا اور مسند حاصل کرنے کے لئے سیاسی توڑ جوڑ میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ شیخ مولانا شہباز بھاگل پوری کی مقبولیت سن کر وہ ان کے پاس پہنچا۔ شیخ اس وقت تعلیم دے رہے تھے۔ انہوں نے شاہجہاں کو شاہی لباس میں دیکھ کر اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ شاہجہاں نے جب شیخ سے کہا، میں کچھ کام سے آپ سے ملنے آیا ہوں۔ شیخ نے کہا کہ تم بادشاہت کی خواہش رکھتے ہو، لیکن میں دیکھتا ہوں تمہارا لباس شریعت کی حد سے باہر ہے۔ اگر تم شریعتِ محمدی پر قائم نہیں رہو گے تو تمہاری رعایا کا کیا حال ہوگا۔ شاہ جہاں نے کہا، جو شیخ کا حکم ہو، اسے ماننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے کہا، جو تمہارا لباس شریعت کی حدود سے باہر ہے، اسے پھاڑ کر ان طالب علموں کو دے دو، جو اپنی ٹوپیاں بنالیں۔ شاہجہاں نے اسی وقت اپنے شاہی لباس کو پھاڑ دیا اور شیخ سے درخواست کی کہ میں ہندوستان کی بادشاہت کی خواہش رکھتا ہوں۔ سیاسی حکمت جاری ہے۔ اگر مسند میرے نصیب میں ہے تو میں جنگ کی تیاری کروں۔ شیخ نے کہا، آثار تو ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ شاہجہاں نے اس بات کو سنتے ہی جنگ کی تیاری شروع کردی۔ شیخ کی پیشن گوئی کے مطابق اسے تخت اور تاج مل گیا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد شاہجہاں نے بہت کوشش کی کہ شیخ کسی طرح اپنی خدمت میں آنے کا حکم دے دیں، لیکن شیخ نے بالکل ہی اس سے انکار کردیا اور کہا کہ پہلے تم ایک شہزادہ تھے تو تم سے ملاقات مناسب تھی لیکن اب تم ایک بادشاہ ہو، اس لئے اب تم سے ملاقات مناسب نہیں ہے۔ یاد رکھو اگر تم نے ہم سے ملاقات کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ شاہجہاں نے ان کی خدمت میں کچھ گاؤں کے فرمان بھیجے لیکن شیخ نے نامنظور کردیا[5]۔

اورنگ زیب (1658-1707ء) اور صوفیاء

سرمد شہید اور اورنگ زیب

اورنگ زیب نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد، علماء کے ذریعہ کفر کا فتویٰ دلوا کر، اپنے بھائی داراشکوہ کو قتل کروادیا، لیکن داراشکوہ کے گہرے دوست شیخ سرمد ابھی دہلی کے عوام کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے، جو دہلی اور دہلی کے اطراف میں رہنے والوں کی روح تھے۔ ان کے

اشارے پر دہلی کا اقتدار بدل سکتا تھا۔ سرمد کو اپنے دوست کے بچھڑنے کا افسوس تو تھا ہی، لیکن انہیں ان سیاسی جھگڑوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کو اس کے چاپلوس علماء نے یہ پیغام دیا کہ یہ فقیر داراشکوہ کا ساتھی رہا ہے، جو حکومت کے کاموں میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے، لیکن اورنگ زیب نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی۔ کچھ علماء سرمد کے خلاف سازش رچنے میں مسلسل لگے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ درباریوں نے اورنگ زیب سے شکایت کی کہ سرمد ہمیشہ ننگا رہتے ہیں۔ اورنگ زیب نے کچھ لوگوں کو سرمد کے پاس ان کے ننگے رہنے کا سبب معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ جب درباریوں نے سرمد سے ننگے رہنے کا سبب پوچھا، تو سرمد نے جواب دیا، کہ کیا کروں ''شیطان قوی ہے''۔

ایک مرتبہ جب اورنگ زیب نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو دیکھا کہ سرمد ننگے مسجد کی سیڑھی پر بیٹھے ہیں۔ اورنگ زیب نے سرمد کو ایسی حالت میں دیکھ کر کہا کہ آپ اس مسجد کی سیڑھی پر ایسے ننگے بیٹھ کر نمازیوں کے وضو کیوں خراب کر رہے ہیں۔ کم سے کم اپنا کمبل ہی ڈال لیتے۔ سرمد نے کہا، تم ہی اٹھا کر میرے اوپر ڈال دو۔ جب اورنگ زیب نے کمبل اٹھایا تو دیکھا کہ اس کمبل کے نیچے اس کے بھائی کا سر اور تازہ خون ڈھکا ہوا ہے۔ اس حالت کو اورنگ زیب دیکھ کر گھبرا گیا اور اس کے ہاتھوں سے کمبل چھوٹ گیا۔ تب سرمد نے کہا، بتا تیرے گناہوں کو ڈھکوں یا اپنے جسم کو؟ اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپکے سے لوٹ گیا۔

ایک مرتبہ اورنگ زیب سے علماء نے شکایت کی کہ سرمد شریعت کو نہیں مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ کلمۂ شہادت بھی اپنے زبان پر نہیں لاتے ہیں۔ وہ کھلے طور پر، خدا اور اس کے رسول کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اورنگ زیب نے سرمد کو دربار میں بلایا۔ سرمد علماء کے درمیان دربار میں حاضر ہوئے۔ علماء نے سرمد سے کلمۂ شہادت پڑھنے کو کہا۔ سرمد نے اپنی عادت کے مطابق صرف اتنا پڑھا ''لا الٰہ'' یعنی کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کلمہ کو سنتے ہی علماء نے کہا، اس سے آگے پڑھو، سرمد نے کہا، اس سے آگے ابھی میں نہیں پہنچ پایا ہوں۔ ابھی میں نفی، انکار میں ڈوبا ہوا ہوں۔ اقرار تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ اگر لا الٰہ الا اللہ کہوں گا تو جھوٹ ہوگا، اور جو دل میں نہ ہو، وہ زبان پر کیسے آ سکتا ہے؟ سرمد کی اس وضاحت سے علماء نے کہا، توبہ کرو، ورنہ قتل کا فتویٰ جاری کر دیا جائے گا۔ سرمد نے توبہ کرنے سے انکار کر دیا۔ علماء نے سرمد پر کفر کا فتویٰ لگا کر قتل کا اعلان کر دیا۔ فتویٰ کے مطابق سرمد کو 1661 عیسوی

میں قتل کردیا گیا۔ ان کے تن سے کٹا سر جوزندگی میں نامکمل کلمہ پڑھنے کے سبب، قتل ہونا پڑا، اسے قتل کے بعد، پورا کردیا۔ جسم سے ان کا سرالگ ہوتے ہی تین مرتبہ ''الا اللہ'' کہا۔ کئی جگہوں پر تو بہت مرتبہ کٹے سر کو کلمہ پڑھتے رہنے کا ذکر ملتا ہے۔ جب سرمد کا سر جسم سے الگ ہوا، تو غصے میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے اوپر چڑھنے لگا۔ اس غصے کو دیکھ کر ان کے پیر ہرے بھرے شاہ نے انہیں رکنے کا حکم دیا اور ان کا سر وہیں رک گیا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔[6]

مغل بادشاہ فروخ سیر (1713-19ء) اور صوفیاء

شیخ شاہ کلیم اللہ اور فروخ سیر

شیخ کلیم اللہ کے والد شیخ نور اللہ صدیقی دور شاہجہانی کے مشہور انجینئر تھے۔ فنِ تعمیر اور علم حساب میں مہارت کے سبب شاہ جہاں کے دربار میں، انہیں بڑی عزت حاصل تھی۔ خوبصورت محراب بنانے کے فن میں انہیں عبور حاصل تھا۔ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے تاج محل کے محراب، کی تعمیر ان کے والد نور اللہ صدیقی کی دیکھ ریکھ میں ہوئی تھی۔

شیخ شاہ کلیم اللہ کی پیدائش 1650 عیسوی میں ہوئی اور ان کی وفات 1730 عیسوی میں ہوئی۔ یہ چشتیہ سلسلے کے مشہور صوفی مانے جاتے ہیں۔ چشتیہ سلسلے کو آپ نے ایسے وقت میں عروج پر پہنچایا، جس وقت چشتیہ سلسلہ اپنا دم توڑ چکا تھا۔ شیخ شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی، دہلی کے تمام عوام اور حکمراں طبقے کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے۔ امراء اور حکمراں طبقہ کے ذریعہ دیئے جانے والے نذرانے کو وہ قبول کر لیتے تھے، لیکن بادشاہ کے ذریعہ دیجانے والی رقم اور نذرانے کو قبول نہیں کرتے تھے۔ چشتیہ سلسلے کی جو اپنی قدیم روایت تھی، کہ اپنے آپ کو سلطنت سے الگ تھلگ رکھنا، اس روایت کو شیخ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی نے، اپنی زندگی میں باقی رکھا اور سختی کے ساتھ اس پر قائم بھی رہے۔[7]

خانقاہ میں جو بھی تحفہ، نذرانے کی شکل میں رقم آتی تھی، اسے لنگر خانہ (غریبوں کے کھانے) پر خرچ کردیا جاتا تھا۔ بادشاہ فروخ سیر نے بہت چاہا کہ خانقاہ کے خرچ کے تئیں بادشاہ کے ذریعہ دی جانے والی جاگیر، وہ قبول کرلیں، لیکن شیخ نے ہمیشہ اپنی خانقاہ کو سلطنت سے الگ رکھا۔[8]

حوالہ جات

1. رئیس احمد جعفری، انوار اولیاء کامل، نئی دہلی، (1986)، صفحہ نمبر 430
2. ایضاً صفحہ نمبر 471
3. ایضاً صفحہ نمبر 471
4. شیخ محمد اکرام، آب کوثر، (اردو) دہلی، (1984)، صفحہ نمبر 39
5. رئیس احمد جعفری، انوار اولیاء دہلی کامل، نئی دہلی، (1986)، صفحہ نمبر 472-475
6. افضال عباسی، اولیاء ہندو پاک، (ہندی)، نئی دہلی (1998)، صفحہ نمبر 130
7. ایضاً صفحہ نمبر 146-148
8. ایضاً صفحہ نمبر 155

☆☆☆

ساتواں باب

ہندوستان میں درگاہ کے قیام کی روایت

ہندوستان میں درگاہ کے قیام کی روایت کے سلسلے میں روشنی ڈالنے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلام یعنی مسلمانوں میں درگاہ قائم کرنے کی روایت کہاں سے شروع ہوکر ہندوستان میں پہنچی ہے؟ اور اس سلسلے میں اسلام یعنی پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا کیا خیال ہے؟

عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں اسلام کا نظریہ

کسی بھی عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے مسلمانوں کو یہ کہا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ضیاع وقت کا کام عمارت کی تعمیر ہے۔ انہوں نے کہا کہ اپنا مال، پیسہ اور وقت عمارت کی تعمیر میں نہیں، بلکہ اسلام مذہب کی ترقی اور اپنی تعلیم اور اخلاق کی بہتری پر خرچ کرو۔ جیسا کہ ابن سعد نے سیرتِ نبی پر اپنی مشہور کتاب ''طبقات'' میں عبداللہ بن یزید کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ مدینہ شہر سے باہر گئے، اسی راستے میں حضرت عمرؓ نے پکی اینٹوں سے دیوار بنا کر حجرے میں توسیع کر لی۔ جب پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ آئے تو، ناراض ہوکر کہا کہ سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا کام مکانوں کی تعمیر ہے، جو ایک ایمان والے کے ایمان کی دولت کو چاٹ جاتی ہے[1]۔ عمارت کے تعمیری کام کے سلسلے میں پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کے بیان وخیال کا اثر خلفاء راشدین پر خاص طور سے پڑا، ان

چاروں خلفاؤں نے مسجد کی تعمیر کے علاوہ کوئی دیگر تعمیرات میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور نہ تاریخ میں اس طرح کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد کی قبر پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی وصیت کے مطابق انہیں مسجد نبوی سے متصل اپنے گھر میں دفنایا گیا[2]۔ اسی گھر میں بچی ہوئی تھوڑی سی جگہ میں اول خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق اور ثانی خلیفہ حضرت عمر بن الخطاب کو بھی دفنایا گیا، جو ایک معمولی گھر تھا۔ کچھ وقت بعد امیہ دور میں جب وہ گھر خستہ حالت میں ہو گیا تو پیغمبر اسلام کی قبر کو تحفظ کے نقطہ نظر سے پکی اینٹوں سے محفوظ کرنے کا کام کیا گیا۔ اسی دورِ عہد میں خلافت میں بادشاہت کا تصور پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ دھیرے دھیرے یہ تصور ہر طرف پھیل گیا اور تعمیری کام، حفاظت اور سلطنت کے جاہ جلال کے نام پر ہونے لگا۔

عہد اموی سے ہی خلافت میں بادشاہت کے نظریہ کا ابتدا ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے دنیاوی جاہ جلال کی چیزیں سلطنت میں داخل ہونے لگیں۔ خاص کر فن تعمیر میں اس کا استعمال ہونا شروع ہو گیا۔

ان چاروں خلفاء کے بعد جو خلافت کی روایت شروع ہوئی اس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد کے حکم کی اندیکھی ہونا شروع ہو گئی۔ اب پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں اور انکے ذریعہ بتائے گئے طریقوں پر چلنے نیز اسے مکمل طور پر ماننے کے بجائے انکی قبر کو مزید محفوظ اور خوبصورت بنانے کی طرف زیادہ دلچسپی اور توجہ دی جانے لگی اور دھیرے دھیرے اس گھر کو جس میں پیغمبر اسلام دفن تھے، حفاظت اور عقیدت کے نام پر اسے پکی اینٹوں سے چاروں طرف زمین کے نیچے کے حصے کو شیشے پلا کر محفوظ کر دیا گیا۔ جب تحفظ کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تو اسے خوبصورت بنانے کا کام بھی شروع ہو گیا۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد کی قبر پر ہوئے تعمیری کام کو ہی بنیاد بنا کر ہندوستان میں صوفیاء کرام اور سلطانوں نیز بادشاہوں اور امراء کی قبروں پر خوبصورت اور شاندار طریقے پر فن تعمیر کا مظاہرہ کیا جانے لگا۔ ساتھ ہی پیغمبر اسلام کی قبر مسجد نبوی سے متصل ہونے کو بنیاد بنا کر ہر درگاہ اور مقبرے کے ساتھ مسجد بھی بنائی گئی۔ ہندوستان میں سب سے پہلے نصیر الدین محمود (سلطان غاری) کا مقبرہ بنایا گیا۔ جس کی تعمیر 1229 عیسوی میں

سلطان التمش نے کی۔ اسی کے ساتھ ہندوستان میں درگاہ اور مقبرہ بنانے کی روایت شروع ہوگئی۔ 1240 عیسوی میں شاہ ترکمان کی درگاہ سلطان معیز الدین بہرام شاہ نے مکمل کرائی۔

اسی کے ساتھ ہی خواجہ معین الدین چشتی (اجمیر) کی درگاہ قائم کی گئی۔ ہندوستان میں یہیں سے درگاہ بنانے کی روایت شروع ہوگئی، اور دہلی میں شیخ شہاب الدین عاشق اللہ (1317 عیسوی)، سید بدرالدین شاہ سمرقندی (1297 عیسوی)، شیخ ضیاء الدین رومی (1321 عیسوی)، شیخ امام الدین فردوسی (1329 عیسوی)، شیخ نظام الدین اولیاء (1325 عیسوی)، شیخ عثمان سیاح (1337 عیسوی)، شیخ صلاح الدین (1348 عیسوی)، شیخ علامہ کمال الدین (1355 عیسوی)، شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی (1356 عیسوی)، شیخ حیدر (1357 عیسوی)، قدم شریف (1374 عیسوی)، سید محمود بحار (1376 عیسوی)، شیخ کبیر الدین اولیاء (1394 عیسوی)، شیخ مخدوم سماع الدین (1495 عیسوی)، یوسف قتال (1526 عیسوی)، مولانا جمالی (1535 عیسوی)، امام ضامن (1537 عیسوی)، شیخ سلیمان (1537 عیسوی)، خواجہ باقی باللہ (1603 عیسوی)، شیخ علاء الدین (1541 عیسوی)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1641 عیسوی)، سید حسن رسول نما (1691 عیسوی)، خدا نما (1694 عیسوی)، شیخ محمد چشتی (1708 عیسوی)، سید شاہ عالم (1720 عیسوی)، شیخ شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی (1729 عیسوی)، شاہ محمد فرہاد (1732 عیسوی)، حافظ سعد اللہ (1740 عیسوی)، شیخ العالمین عطاء اللہ (1769 عیسوی)، مرزا مظہر جان جاناں (1780 عیسوی)، خواجہ علی احمد احراری (1784 عیسوی)، مولانا فخر الدین چشتی (1784 عیسوی)، شیخ شاہ صابر علی چشتی (1822 عیسوی)، میر محمدی (1826 عیسوی)، شاہ محمد آفاق (1835 عیسوی)، کی درگاہیں قائم کی گئیں۔

دہلی کے علاوہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں، شیخ ابوبکر موء تاب (بدایوں)، شاہ عبد الرزاق (جھن جھانہ)، بدیع الدین مدار (مکن پور)، شیخ حسام الدین (مکن پور)، شاہ پیر محمد (سلون، رائے بریلی)، شیخ سلیم چشتی (فتح پور سیکری)، شیخ محمد غوث (گوالیار)، بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (پاک پٹن)، شیخ علاء الدین (کلیر شریف)، عبدالقدوس گنگوہی (سہارنپور)، شاہ عبد الهادی (امروہا)، شاہ ولایت (امروہا)، سید نور اللہ (آگرہ)، شیخ محمد ترک (نارنولی، ہریانہ)، شیخ نظام (نارنولی)، شیخ جمال الدین احمد (ہانسی)، شیخ حمید الدین الصوفی (ناگور)،

راجستھان)، شیخ احمد سرہندی (سرہند، پنجاب)، شیخ شرف الدین یحیٰی منیری (بہار شریف)، نیز پھلواری شریف (پٹنہ، بہار) اور کشمیر میں اور پنجاب، بنگال اور ہندوستان کے کئی حصوں میں بے شمار درگاہوں کی تعمیر کا کام کیا گیا۔

درگاہ کے فن تعمیر کی خصوصیات

درگاہوں کی تعمیر کی اپنی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ دیگر تاریخی عمارتیں۔ سلطانوں اور بادشاہوں کے مقبرے کے مقابلے میں اس کی کیا اہمیت اور خصوصیات ہیں؟ اس سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو خصوصیت ایک صوفی اور سلطان کی زندگی میں تھی وہی خصوصیت ان کے تعمیری کاموں میں بھی لازمی طور سے دکھائی دیتی ہے۔ ایک سلطان کی زندگی اور اس کا رہن سہن شان وشوکت پر مبنی ہوتا تھا لیکن صوفیاء مختصرانہ اور پاک صاف زندگی گزارنا پسند کرتے تھے۔ ٹھیک یہی خصوصیت ان کی وفات کے بعد ان کی قبر کے اوپر ہوئی تعمیری کاموں میں بھی جھلکتی ہے۔ ایک سلطان اور بادشاہ کی وفات کے بعد اس کی قبر کے اوپر تعمیر شدہ مقبرے کو بڑے ہی خوبصورت اور شاندار انداز میں بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے لئے، گھسے لال بلوا پتھر، اعلیٰ قسم کے میٹریل اور سنگ مرمر کے اوپر پچکاری اور مختلف نقش ونگار بنا کر اسے معیاری طریقے سے مزید دلکش بنانے کا کام کیا گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس کے خوبصورت دروازے سمیت چاروں طرف سے چہار دیواری کے ساتھ ایک شاندار استقبالیہ دروازہ بھی بنایا گیا، جس کی چہار دیواری کے صحن میں بڑے خوبصورت باغ لگائے گئے ہیں، لیکن ایک صوفی کی قبر پر بنے درگاہ کی تعمیر میں یہ تمام چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک صوفی کی زندگی معمولی اور زینت سے الگ ہوتی تھی، ان کی وفات کے بعد ان کی قبر پر درگاہ تعمیر کرنے میں بھی ان باتوں کا خیال خاص طور پر رکھا گیا ہے، جو ان کی درگاہوں میں صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔ عہد وسطیٰ میں دہلی کے اندر جو درگاہیں تعمیر ہوئیں ہیں وہ تقریباً ایک ہی طرز پر تعمیر کی گئی ہیں۔ ان کی تعمیر ایک عام معمولی چبوترے کے اوپر بارہ بھورے رنگ کے کھمبوں کا استعمال کر کے اس کے اوپر شہتیر پتھر کو استعمال کر کے، اوپر گنبد بنایا گیا ہے۔ ان کھمبوں کے سہارے لال بلوا پتھر یا سنگ مرمر کی جالی بنائی گئی ہے۔ قبر کی تعمیر میں معمولی سنگ مرمر یا چونے پتھر کا استعمال کیا گیا ہے، مگر یہ درگاہیں روحانیت کا مظہر ہیں۔ درگاہ کی تعمیر کو سلطانوں اور بادشاہوں کے

مقبرے کی تعمیر کے مقابلے میں زیادہ آراستہ نہیں کیا گیا ہے جس سے اس میں پُرکشش ماحول پیدا ہو سکے۔ اس طرح کا کام دہلی میں تعمیر شدہ کسی بھی صوفی کی درگاہ میں نہیں دکھائی دیتا ہے۔

درگاہ کے فن تعمیر کی بنیادی خصوصیات

درحقیقت درگاہوں کی تعمیر میں کھمبوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے درمیان جالیاں بنائی گئی ہیں اور جنوب کی طرف ایک دروازہ ہے جس کے اوپر گنبد اور چھت تعمیر کی گئی ہے۔ کسی کسی درگاہ میں عمارت کے چاروں طرف کھلا برآمدہ بھی بنایا گیا ہے جو بعد میں اضافی کام کی شکل میں انجام دیا گیا ہے۔ جس کے چاروں طرف پختہ آنگن بنائے گئے ہیں اور چہار طرف چہار دیواری بھی بنائی گئی ہے۔ درگاہوں کے اندر دعاؤں کے لئے قبلہ کی جانب محرابی مقصورے بنائے گئے ہیں۔ قبر کے شمال میں کتبہ لگایا گیا ہے اور اس کے پیچھے موم بتی اور اگربتی جلانے کے لئے روشن دان بنائے گئے ہیں۔ درگاہ کے احاطے میں عقیدت مندوں کے آرام کے لئے برآمدہ بنایا گیا ہے اور ہر درگاہ کے ساتھ ایک مسجد بھی بنائی گئی ہے جیسا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد کی قبر کے ساتھ مسجد نبوی بنی ہوئی ہے اس کے علاوہ درگاہوں کے ساتھ مجلس خانہ کی بھی تعمیر کی گئی ہے۔

حوالاجات

1. سر سید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد ایک، صفحہ نمبر 29
2. چمن اسلام، مکتبہ ترجمان، (1985)، جلد 4، صفحہ نمبر 52

☆☆☆

آٹھواں باب

عہد وسطیٰ کے حکمرانوں کا درگاہوں سے تعلق

صوفیاء کرام کی قربانیوں اور سخت مجاہدوں نے پورے سماج پر اس طرح سے چھاپ چھوڑی کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان کا اثر اور ان کی عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ان کی عقیدت و احترام میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور چودہیں صدی عیسوی کے صوفی شیخ نظام الدین اولیاء سے عقیدت اور ان کے احترام اٹھارہویں صدی عیسوی یعنی مغل دور کے اختتام عہد در عہد تک اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔

دہلی سلطنت اور مغل عہد کے تمام حکمرانوں کا تعلق ان درگاہوں سے اپنے روحانی سکون کی خاطر رہا ہے۔ عہد وسطیٰ کے تمام سلطان اور بادشاہ کسی بھی جنگ پر جانے سے پہلے یا کسی مصیبت کے وقت ان درگاہوں پر حاضر ہوتے تھے۔ اتنا ہی نہیں ان درگاہوں کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مغل بادشاہ ان صوفیاء کے قریب ہی دفن ہونے کی تمنا کرنے لگے۔ ان کا یقین تھا کہ اس پاکیزہ مقام پر لیٹے ہوئے بزرگ کے طفیل میں وہ بھی قیامت کے دن ان کے گروہ کے ساتھ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اسی نقطہ نظر سے مغلوں کا اپنا خاندانی قبرستان ہمایوں کے مقبرے کی تعمیر، شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ سے متصل غیاث

پوری میں کی گئی۔ تا کہ اس مقدس زمین جہاں پر شیخ نظام الدین اولیاء نے عبادت و ریاضت کی ہے کے قریب دفن ہونے پر مغفرت مل جائے گی۔

عہدِ سلطنت کے حکمرانوں کا درگاہوں سے تعلق

دھلی میں تعمیر شدہ پھلی درگاہ شاہ ترکمان بیابانی سھروردی سے سلطنت کا تعلق

دہلی سلطنت کے دور میں اول درگاہ کی تعمیر درگاہِ ترکمان شاہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہ اپنے وقت کے مشہور بزرگ مانے جاتے تھے، جو شمس العارفین کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی وفات 1240 عیسوی میں معز الدین بہرام شاہ کے دور میں ہوئی اور اسی دور میں اُن کی درگاہ بھی تعمیر کی گئی۔ جب رضیہ سلطانہ کا قتل 1240ء میں ہوا تو اسے ان کی درگاہ کے قریب دفنایا گیا۔ جب شاہ جہاں نے شاہ جہان آباد کی تعمیر کرائی تو ان کی درگاہ کے قریب شاہ جہان آباد کا ایک دروازہ ان کے نام سے یعنی ترکمان دروازہ کے نام سے تعمیر کروایا جو آج بھی ترکمان گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔

سلطان محمد بن تغلق (1325-1351ء) اور درگاہ

دہلی سلطنت کے مشہور حکمراں سلطان محمد بن تغلق جس کا ذکر صوفیاء کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے حکمراں کے طور پر مورخ نے تاریخ کے صفحہ پر رقم کیا ہے۔ محمد بن تغلق نے اپنے دورِ اقتدار میں متعدد صوفیاء کے مزاروں اور درگاہوں کی تعمیر کرائی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی خواہش نہیں تھی کہ انہیں کسی عمارت کے نیچے دفن کیا جائے۔ لیکن سلطان محمد بن تغلق نے ان کی عقیدت میں ان کے مزار پر ایک عالیشان گنبد کی تعمیر کرائی[1]۔ اس کے علاوہ سلطان محمد بن تغلق نے اجودھن میں شیخ علاء الدین کی قبر پر بھی ایک عالیشان گنبد کی تعمیر کرائی۔ ساتھ ہی ملتان میں شیخ رکن الدین کے مزار کی تعمیر کرائی[2]۔ برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق سید سالار مسعود غازی کی درگاہ پر حاضری بھی دیا کرتا تھا اور وہاں کے مجاوروں کو بہت سارا صدقہ بھی دیتا تھا[3]۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (1351-1388ء) اور درگاہ

سلطان فیروز شاہ تغلق نے بہت سارے مقبروں اور مزاروں کی تعمیر کرائی۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے داخلہ دروازہ اور چاروں طرف سے صندل کی جالیاں بنوائی اور سونے کی قندیلیں، سونے کی زنجیروں سے باندھ کر چاروں کناروں پر لٹکانے کا کام کروایا [4]۔ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی درگاہ اور اس کے شاندار استقبالیہ دروازہ میں لگے کتبے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس درگاہ کی تعمیر سلطان فیروز شاہ تغلق نے ان کی زندگی میں ہی تعمیر کروائی تھی [5]۔

فیروز شاہ تغلق نے محمد بن تغلق کے دور کے مشہور صوفی شیخ صلاح الدین درویش کی درگاہ کی تعمیر 1353ء میں کرائی۔ جس میں گنبد اور چاروں طرف کھمبے کے درمیان جالیاں بنوائیں، ساتھ ہی ایک مسجد اور مجلس خانہ کی تعمیر بھی کرائی [6]۔

درگاہِ قدم شریف کی تعمیر اور اس کے ساتھ مسجد اور حوض کی تعمیر 1374 عیسوی میں سلطان فیروز شاہ تغلق نے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے قدم مبارک اور اس کے عہد کے مشہور صوفی مخدوم جہانیانِ جہاں گست کی عقیدت میں کروایا تھا [7]۔ سید محمود بحار کی درگاہ جو مہارانی باغ کیلوکھری گاؤں میں تعمیر ہے، 1376 عیسوی میں ان کی وفات کے بعد فیروز شاہ تغلق نے اس درگاہ کی تعمیر کروائی [8]۔ ''سیرتِ فیروز شاہی'' میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق اپنی ماں اور اپنے اسلاف کے مقبرے کے ساتھ ساتھ صوفیاء کی درگاہ اور مزار پر بھی جاتا تھا۔ جب اسے کسی جنگ پر جانا ہوتا تھا تو وہ خاص طور سے صوفیاء کرام کی درگاہوں پر حاضر ہوتا تھا اور وہاں فاتحہ پڑھتا تھا۔ شیخ بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر حاضر ہونے کا تذکرہ تو کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ ایک مرتبہ جنگ پر جاتے وقت چشتی صوفیاء کی درگاہوں پر حاضری دی اور لوٹتے وقت سہروردی سلسلے کے صوفیاء کے مزار پر بھی گیا۔ 1374 عیسوی میں بہرائچ گیا اور شیخ سید سالار مسعود غازی کے مزار پر حاضر ہوا اور کئی دنوں تک وہاں ٹھہرا بھی تھا [9]۔

1379 عیسوی میں فیروز شاہ تغلق کے دور اقتدار میں شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب ہی باؤلی کے جنوبی طرف تعمیر شدہ عمارت پر لگے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر فیروز شاہ کے دور میں محمد معروف بن وحید الدین نے کروائی تھی [10]۔

فیروز شاہ تغلق کے وزیر اعظم خان جہاں تلنگانی جس کو شیخ نظام الدین اولیاء سے بیحد عقیدت تھی کا مقبرہ بھی شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے جنوبی جانب کچھ دوری پر 1370 عیسوی میں اس کے انتقال کے بعد تعمیر کی گئی، جو آج بھی اپنی محفوظ حالت میں ہے۔لیکن اب یہ رہائش کے لئے استعمال کی جارہی ہے

شیخ نظام الدین اولیاء کی عقیدت میں فیروز شاہ تغلق نے 1353 عیسوی میں ان کی درگاہ کے جانب مغرب بنے جماعت خانہ کے دونوں طرف گنبد نما دالان کی تعمیر کروائی[11]۔

درگاہِ قدم شریف کی عقیدت میں اُس کے قریب 1374 عیسوی میں فیروز شاہ تغلق کے دور میں خان جہاں تلنگانی نے ایک مسجد کی تعمیر کروائی، جو ''چوراہا قدم شریف مسجد'' کے نام سے مشہور ہوئی[12]۔

عہدِ سید اور لودی (1414-1526ء) اور درگاہ

سید لودی کے دور کے سلطانوں کے پاس مالی سہولتوں کی کمی تھی پھر بھی انکے دور میں کچھ درگاہوں کی تعمیر ہوئی۔ شیخ جمالی اور درگاہِ یوسف قتال کی تعمیر سید لودی کے دور میں ہوئی، لیکن اس کی تعمیر سلطانوں نے نہیں کی، بلکہ خود ان بزرگوں نے سلطنت کی مدد سے کی تھی۔

سلطان سکندر لودی کو ان درگاہوں سے بڑی عقیدت تھی۔ ''طبقاتِ اکبری'' کے حوالے سے مورخ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ بہار میں قیام کے وقت سلطان سکندر لودی، شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مزار پر حاضر ہوا تھا اور وہاں کے غریبوں اور فقیروں کو خیرات دیا تھا[13]۔

سلطان سکندر لودی، چراغِ دہلی کی درگاہ سے بھی عقیدت رکھتا تھا۔ جب اس کے والد سلطان بہلول لودی کی وفات بھداولی کے قریب 1488 عیسوی میں ہوئی تو اس نے وہاں سے ان کو دہلی لاکر شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی درگاہ کے قریب انہیں دفنا دیا اور وہیں سلطان سکندر لودی نے ان کا مقبرہ بھی تعمیر کروایا، تاکہ قیامت کے دن اس کے والد کو اس بزرگ کے طفیل میں مغفرت مل جائے۔

عہدِ سوری (1540-1555ء) اور درگاہ

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات 1236 عیسوی میں ہوئی اور جہاں ان کی خانقاہ تھی، وہیں دفنائے گئے۔ پندرہویں صدی عیسوی تک ان کی قبر پر کوئی تعمیری کام نہیں ہوا۔ سب سے پہلے شیر شاہ کے زمانے میں خلیل اللہ خان نے 1541 عیسوی میں چاروں طرف سے چہار دیواری اور ایک خوبصورت داخلی دروازہ بنوائی، جواب موجود نہیں ہے۔[14]

1551 عیسوی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی قبر کے چاروں طرف بنی دیواروں میں سوری خاندان کے دور کے حکمراں اسلام شاہ کے زمانے میں یوسف خاں نے ایک شاندار استقبالیہ دروازہ تعمیر کروائی اور اسی زمانے میں اسلام شاہ نے قطب الدین بختیار کاکی کے ذریعہ بنائی گئی مسجد کو پکی اینٹوں سے تعمیر کروانے کا کام کیا۔[15]

درگاہ کے شمالی طرف دروازے پر لگے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ کے زمانے میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی عقیدت میں خلیل اللہ خاں نے 1542 عیسوی میں اس دروازے (داخلہ دروازہ) کی تعمیر کروائی۔[16]

حوالاجات

1. خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، (اردو)، دہلی، (1981)، صفحہ نمبر 375
2. ایضاً، صفحہ نمبر 375
3. ایضاً، صفحہ نمبر 376
4. ایضاً، صفحہ نمبر 407
5. سر سید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو) نئی دہلی، (1992)، جلد 3، صفحہ نمبر 332
6. ایضاً، صفحہ نمبر 323
7. ایضاً، صفحہ نمبر 327
8. ایضاً، صفحہ نمبر 327
9. خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، (اردو)، دہلی، (1981)، صفحہ نمبر 404-405

.10 سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ 320

.11 ایضاً، صفحہ نمبر 323

.12 ایضاً، صفحہ نمبر 327

.13 خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، (اردو)، دہلی، (1981)، صفحہ نمبر 457

.14 سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد 3، صفحہ نمبر 375

.15 ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 3[illegible]-337

.16 ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 330

☆☆☆

نواں باب

عہد مُغل (1526-1707ء) کے حکمرانوں کا درگاہوں سے تعلق

مغل بادشاہوں کو صوفیاء کی درگاہوں سے خاص لگاؤ تھا، اپنی زندگی میں ان کی درگاہوں پر حاضری دینا اور ان درگاہوں کی عزت وعقیدت کو برقرار رکھنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔ مغل بادشاہوں کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ صوفی اللہ کے ولی کامل بندے ہیں، جنہیں اللہ آخرت میں خاص مقام عطا فرمائے گا اور قیامت کے دن جو بھی اس مقام سے اٹھے گا سیدھے جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے زیادہ تر بادشاہ ان درگاہوں کے قریب ہی دفن ہونا چاہتے تھے۔ اکبر کے دور عہد میں 1565 عیسوی میں تعمیر ہونے والا مغلوں کا پہلا مقبرہ "مقبرہ ہمایوں" شیخ نظام الدین اولیاء کی عقیدت میں ان کی خانقاہ سے متصل غیاث پور میں تعمیر کیا گیا۔

اکبر (1556-1605ء) اور درگاہ

اکبر کو ان صوفیاء کی خانقاہوں اور درگاہوں سے خاص طور پر لگاؤ تھا۔ اکبر کی عقیدت اور محبت کی وجہ سے ہی شیخ سلیم چشتی سلطنت کے ساتھ فتح پور سکری میں رہنے کے لئے راضی ہوئے۔ فتح پور سکری کا بلند دروازہ اکبر نے شیخ سلیم چشتی کی محبت اور ان کے احترام میں ہی تعمیر کروایا تھا۔ اکبر کو خواجہ معین الدین چشتی سے بہت عقیدت تھی۔ وہ ان کی درگاہ کی زیارت کے لئے ہمیشہ جایا کرتا تھا۔ اس نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی درگاہ کی تعمیر بھی کروائی۔ 1603

عیسوی میں حضرت خواجہ باقی باللہ کا مزار بھی تعمیر کرایا۔ فتح پور سکری میں شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ اور درگاہ کے ڈھانچے کو بھی اکبر نے تیار کروایا تھا[1]۔ جس کی زینت کاری کا کام جہانگیر نے کیا تھا۔

اکبر کے دورِ اقتدار میں 1588 عیسوی میں سید مہدی نے امیر خسرو کے مزار کے چاروں طرف خوبصورت مجر کی تعمیر کروائی[2]۔

1562 عیسوی میں شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں اکبر کے دور میں ہی فرید خان نے چاروں طرف سے سنگ مرمر کی جالیاں لگوائی اور گنبد کے اندر سنگ مرمر کے کچھ پنکھڑیاں بھی نقش کرائے[3]۔

اکبر کا سب سے قریبی درباری اتکا خان جس کی بیوی کا دودھ اکبر نے پیا تھا، جو اکبر کے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ 1561 عیسوی میں ادہم خان نے اسے قتل کر دیا اور اسے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب دفنایا گیا، جہاں اکبر نے 1566 عیسوی میں نہایت عالیشان مقبرے کی تعمیر کروائی۔ آج بھی یہ مقبرہ دہلی میں تعمیر ہونے والے خوبصورت مقبروں میں ہمایوں کے مقبرے کے بعد دوسرا مقام رکھتا ہے[4]۔

مغل بادشاہ جہانگیر (1605-1627ء) اور درگاہ

جہانگیر بادشاہ کو بھی شیخ سلیم چشتی سے بہت عقیدت تھی۔ اس نے 1606 عیسوی میں شیخ سلیم چشتی کی درگاہ کو خالص سنگ مرمر سے اس طرح مزین کیا کہ یہ عمارت خوبصورتی میں بے نظیر بن گئی[5]۔

جہانگیر کے دور اقتدار میں 1605 عیسوی میں امیر خسرو کے مزار پر سنگ مرمر کے استعمال سے امام الدین حسن نے پوری درگاہ کی تعمیر کرائی جو آج بھی محفوظ ہے[6]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں جہانگیر کے دور اقتدار میں 1608 عیسوی میں سیپ سے پچکاری کا کام کیا گیا اور مزار کے اوپر صندل کی لکڑی کی چھپر چڑھائی گئی جو ایک انمول رتن یعنی انتہائی معیاری کام کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ یہ آج بھی درگاہ کے اندر کتبہ کی شکل میں محفوظ ہے[7]۔

جہانگیر نے 1623ء میں بیگم پور مسجد کے قریب شیخ فرید جو شیخ احمد بخاری کے صاحبزادے تھے، ان کی درگاہ تعمیر کرائی۔ جہانگیر نے انہیں مرتضٰے خان کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ اب ان

کی درگاہ اپنی اصلی حالت میں نہیں رہ گئی۔اس کا پورا ڈھانچہ گر گیا ہے[8]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ اور خانقاہ غیاث پور میں تعمیر ہونے کی وجہ سے اس علاقہ اور مقام کو عقیدت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔اتکا خان جو اکبر کے سب سے قریبی درباری تھا، جس کا بیٹا مرزا عزیز کوکلتاس جہانگیر کے دور میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا، اس کا انتقال 1624 عیسوی میں احمد آباد گجرات میں ہوا، جسے دہلی لاکر شیخ نظام الدین اولیا کی درگاہ کے قریب دفن کیا گیا جہاں سفید سنگ مرمر کے استعمال سے نہایت خوبصورت مقبرے کی تعمیر کروائی، جس کی تعمیر میں سنگ مرمر کے چوسٹھ کھمبے کا استعمال کیا گیا جو دہلی میں چوسٹھ کھمبا مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔یہ چوسٹھ کھمبا مقبرہ مرزا غالب کے مقبرہ کے پیچھے موجود ہے، جو حسن و جمال میں اپنی مثال آپ ہے۔اس مقبرے میں اور کئی قبریں موجود ہیں۔

جہانگیر کے دور میں بیرم خان کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ غیاث پور میں تعمیر کرنے کا واحد سبب شیخ نظام الدین اولیاء سے محبت اور ان سے روحانی عقیدت تھا۔اسی وجہ سے مقبرے کی تعمیر غیاث پور میں ہوئی۔

عہدِ شاہ جہاں (1627-1658ء) اور درگاہ

شاہ جہاں، اکبر اور جہانگیر کے عہد کے مشہور صوفی شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جن کی وفات 1642 عیسوی میں ہوئی، اسی دور میں ان کی درگاہ حوض شمسی کے قریب، لال بلوا پتھر سے بنا گئی، جو آج بھی حوض شمسی کے قریب محفوظ ہے[9]۔

شاہ جہاں کے دور میں 1626 عیسوی میں سید عابد کا مقبرہ چونے اور اینٹ سے بنایا گیا، جس پر ٹائلس بھی لگائے گئے تھے، لیکن آج یہ مقبرہ اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے، جو لال بنگلہ عمارت کے قریب ہے۔اس کے ساتھ بنی نہریں اور باغ بھی اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں[10]۔

1652 عیسوی میں شاہ جہاں کے عہد میں شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں توسیع کی گئی۔ اس درگاہ کے گنبد کے چاروں طرف لال بلوا پتھر سے کھمبے دار برآمدہ بنایا گیا اور اس میں کتبہ بھی لگایا گیا۔اب یہ برآمدہ موجود نہیں ہے۔1808 عیسوی میں اس لال پتھر سے بنے برآمدے کو

سنگ مرمر کا استعمال کرکے ازسرنو بنایا گیا[11]۔ شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا بیگم کو شیخ نظام الدین اولیاء سے بیحد عقیدت تھی۔ اپنے والد کی وراثت سے جو دختری حصہ ملا تھا، اسے درگاہ کے مجاوروں کو دے کر درگاہ کے قریب دفن ہونے کے لئے زمین حاصل کی اور اپنی زندگی میں ہی سنگ مرمر کا استعمال کرکے انتہائی خوبصورت مجر کی تعمیر کروائی اور وفات کے بعد وہیں دفن ہوئی۔ اس کا مجر آج بھی محفوظ ہے، جو شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے جنوبی حصے میں ہے۔

عہدِ اورنگ زیب (1658-1707ء) اور درگاہ

اورنگ زیب کے عہد میں سید حسن رسول نما جو سید عثمان نارنولی کے صاجزادے ہیں۔ 1691 عیسوی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی سال ان کی درگاہ بنائی گئی۔ جہاں انکی درگاہ بنائی گئی ہے وہ جگہ اس وقت گلابی باغ کے نام سے مشہور تھا۔ وہاں پر ان کی درگاہ کے ساتھ ایک عالیشان دروازہ اور ایک مسجد کی تعمیر کی گئی جو اس وقت اپنی اصلی حالت میں نہیں ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغل بادشاہوں کا درگاہوں سے تعلق

مغل دور کے آخر میں ان درگاہوں کے وقار میں کافی اضافہ ہوا۔ ان درگاہوں کی خوبصورتی اور ان کی عظمت کے لئے ایسے ایسے کام کئے گئے، جو اس سے پہلے کے حکمرانوں نے نہیں کئے۔ ان درگاہوں کے ساتھ مسجد، باغ اور باؤلی کی تعمیر احاطے کے اندر ہوئی۔ اتنا ہی نہیں ان درگاہوں کے چاروں طرف بادشاہ اور اس کے بیٹے اور بیٹیاں دفن ہوئیں، جن کی قبریں آج بھی دیکھنے کو ملتی ہیں، جس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ سے عقیدت

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے صحن میں اورنگ زیب کا ولی عہد، شاہ عالم اول نے، قطب الدین بختیار کاکی کی عقیدت میں، خالص سنگ مرمر سے ایک چھوٹی سی مسجد 1709 عیسوی میں تعمیر کروائی۔ یہ چھوٹی سی "موتی مسجد" بہت ہی خوبصورت اور نگینے کی طرح ہے، جس پر سنگ مرمر کے تین گنبد بنائے گئے ہیں۔ کناروں پر چھوٹے چھوٹے منار برجیوں کی مانند تعمیر کی گئی ہیں۔ آج بھی یہ مسجد اپنی بہتر حالت میں موجود ہے[12]۔

شاہ عالم اول نے قطب الدین بختیار کاکی کی عقیدت میں 1707 عیسوی میں ان کی درگاہ کے جانب مغرب لال بلوا پتھر کے استعمال سے ایک شاندار استقبالیہ دروازہ بنوایا، آج بھی اس کا کچھ حصہ محفوظ ہے[13]۔

موتی مسجد سے متصل جنوب کی طرف 1712 عیسوی میں شاہ عالم اول (1707-1712 عیسوی) کا ولی عہد جہاں دار شاہ (1712-1713 عیسوی) نے ایک خالص سنگ مرمر کے استعمال سے مجر کی تعمیر کروائی۔ اس مجر کا دائرہ 18x14 فٹ ہے، جو چاروں طرف 8 فٹ اونچی جالی سے گھرا ہے۔ یہ مجر موتی مسجد کے صحن سے 4 فٹ اونچائی پر ہے، جس کا داخلی دروازہ مسجد کے صحن میں ہے۔ یہ مجر سنگ مرمر کی انتہائی نفیس جالیوں سے گھرا ہے، جس کے بالائی حصے میں بہت ہی خوبصورت سنگ مرمر کے کنگورے بنائے گئے ہیں۔ گلدستے کی طرح پیراپیٹ بنایا گیا ہے جو اب صرف مغرب اور شمال کی طرف ہی بچا ہے۔ اس چھوٹے سے انوکھے مجر میں بہادر شاہ اول (1707-1712 عیسوی) اور شاہ عالم (1759-1806 عیسوی) اور اکبر ثانی (1806-1837 عیسوی) کی قبریں ہیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی اسی مجر کے اندر دفن ہونے کے لئے جگہ طے کی تھی لیکن بدقسمتی سے رنگون میں دفن ہوئے۔ آج بھی وہ جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ اس مجر میں عالم گیر ثانی کے بیٹے بہادر شاہ اور آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو کی قبریں ہیں۔ آج بھی یہ مجر اپنی محفوظ حالت میں موجود ہے[14]۔ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کے چاروں طرف خالص سنگ مرمر کی جالیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس کی خوبصورت، انوکھی اور پاکیزہ جالی کی تعمیر 1717 عیسوی میں مغل بادشاہ فروخ سیر نے کرائی تھی۔ اس چہار دیواری کے ساتھ سنگ مرمر کے استعمال سے خوبصورت دروازے تعمیر کروائی، جس پر آج بھی کتبے لگے ہیں۔ یہ خوبصورت جالیاں، دیواریں اور داخلے کے دروازے آج بھی محفوظ ہیں[15]۔

قطب الدین بختیار کاکی کے قریب مغل بادشاہ فروخ سیر (1713-1719) نے اس پاکیزہ مقام کے قریب مغلوں کے دفن کے لئے ایک چھوٹی سی چہار دیواری کی تعمیر کرائی[16]۔ جو آج بھی موجود ہے۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر (1837-1857ء) کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے

بے حد عقیدت تھی۔ ان کی عقیدت میں بہادر شاہ ظفر نے ان کی درگاہ سے متصل ایک جھروکہ محل بنوایا، جہاں سلطنت کے کاموں سے نپٹ کر اپنے روحانی سکون کے لئے اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ آج بھی یہ محل جو لال بلوا پتھر سے انتہائی خوبصورت اور شاندار بنا ہے اپنی محفوظ حالت میں درگاہ کے مغرب کی طرف موجود ہے۔ جسے ظفر محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ میں مسجد کے مشرقی جانب حافظ محمد داؤد خان بہادر مستقیم جنگ نے (1844-1846 عیسوی) کے دوران چودہ ہزار روپے خرچ کر کے خوبصورت پتھروں کے استعمال سے کاکی کی عقیدت میں ایک باؤلی کی تعمیر کرائی[17]۔ جو آج بھی درگاہ کے احاطے سے متصل مشرقی طرف محفوظ ہے لیکن استعمال میں نہیں ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی وفات 1236 عیسوی میں ہوئی، لیکن ان کا مقبرہ 1883 عیسوی میں بنایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہماری قبر کو پکی نہ بنوائی جائے، جس کی وجہ سے کسی بھی حکمراں نے ان کی قبر پر تعمیری کام نہیں کیا، لیکن 1883 عیسوی میں محی الدین نے خالص سنگ مرمر سے جالی دار 18x15 فٹ مربع اور دو فٹ اونچا کٹھہرا بنوایا[18] لیکن اصل قبر آج بھی مٹی کی ہے جو ہمیشہ چادر سے ڈھکی رہتی ہے۔

درگاہ شیخ نظام الدین اولیاء سے عقیدت

شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے سلطانوں، باشاہوں اور حکمرانوں کی عقیدت شروع سے تھی، لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس درگاہ کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ اس پاکیزہ اور مقدس مقام کی روحانیت نے حکمرانوں کو تعمیری کام کی طرف زیادہ راغب کیا۔ چنانچہ اس پاکیزہ اور روحانی مقام کی تعمیر کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اتنا ہی نہیں ان حکمرانوں کو اس پاکیزہ احاطے میں دفن ہونے کی خواہش بھی پیدا ہونے لگی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں مغل بادشاہ عالمگیر ثانی نے 1755 عیسوی میں اردو زبان میں کتبہ لگوانے کا کام کیا۔ 1808 عیسوی میں اکبر شاہ ثانی کے دور میں نواب احمد بخش خان بہادر نے درگاہ کے چاروں طرف لگے شاہ جہاں کے دور کے لال پتھر

کے کھمبوں کو نکال کر، اس کی جگہ پر خالص سنگ مرمر کے کھمبے لگوائے۔ ساتھ ہی درگاہ کی چہار دیواری کی مرمت بھی کروائی، اور درگاہ کے شمالی داخلہ دروازہ جو پہلے سے ہی بنا ہوا تھا، اس پر سونے کے پانی سے کتبہ لکھوا کر لگوایا[19]۔

1820 عیسوی یں مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے دور اقتدار میں فضل اللہ خان نے درگاہ کے چاروں طرف بنے کھمبے دار برآمدے کی چھت میں، تانبے کی پرت جڑوائی اور اس میں سونے اور لاجورد سے نقش نگاری کی جو بڑے ہی خوبصورت اور پُرکشش انداز میں کی گئی۔ 1833 عیسوی میں مغل بادشاہ اکبر ثانی کے دور میں ہی درگاہ کے گنبد کو خالص سنگ مرمر سے بنا کر اس کے اوپر سنہری کلش چڑھانے کا کام ہوا[20]۔

مغل بادشاہ محمد شاہ (1719-1748 عیسوی) نے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے احاطے میں 1748 عیسوی سفید سنگ مرمر کا ایک مجر (مقبرہ) بنوایا اور وفات کے بعد وہیں دفن ہوا۔ یہ مجر شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے ٹھیک سامنے اور جہاں آرا بیگم کے مجر سے مشرق کی طرف بالکل متصل ہے۔ یہ مجر سفید سنگ مرمر سے 24 فٹ لمبا اور 16 فٹ چوڑا مربع بنا ہوا ہے، اس کے اوپر بڑے ہی حسین انداز سے گلدستے جالی نما بنائے گئے ہیں۔ اس کے چہار کناروں پر گنبد نما گلدستے لگائے گئے ہیں۔ اس مجر میں جتنی خوبصورت جالی کا استعمال کیا گیا ہے ویسا تاج محل اور لال قلعہ کے دیوان خاص میں کی گئی ہے۔ یہ جالی خوبصورتی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس مجر نما مقبرے کی جو اہمیت ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خالص سنگ مرمر کے ہی چوکھٹ اور کواڑ لگائے گئے ہیں۔ جس پر بڑے ہی خوبصورت انداز سے پھول پتیاں بنائی گئی ہیں، جو انتہائی نفیس ہیں۔ یہ کام آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس مجر میں کئی قبریں ہیں، درمیانی قبر جو بڑی ہے وہ محمد شاہ بادشاہ (1719-1748 عیسوی) کی ہے۔ اس کے مغرب کی طرف محمد بادشاہ کی بیوی محل صاحبہ کی قبر ہے اور دو قبریں محمد بادشاہ کے پوتے مرزا جہانگیر اور مرزا آسوری کی ہیں۔ بشیر محل صحابہ الدین احمد کے مطابق جنوبی جانب مزید دو قبریں نادر شاہ کے پوتے اور بہو اور اس کے دائیں طرف کی قبر نادر شاہ کی چھوٹی بیٹی کی ہے[21]۔

محمد شاہ (1719-1748 عیسوی) کے بیٹے مرزا جہانگیر کی موت جب الہ آباد میں ہوئی، تو

اسے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے احاطے میں ہی دفنایا گیا۔ جہاں 1832 عیسوی میں محمد شاہ بادشاہ کی بیوی اور مرزا جہانگیر کی ماں ممتاز محل نے اس کی قبر کے اوپر مجر نما ایک مقبرہ کی تعمیر کرائی۔ جو شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے احاطے میں خالص سنگ مرمر سے 4 فٹ اونچا بنا ہوا ہے۔ یہ مجر محمد شاہ بادشاہ کے مجر کے سامنے خالص سنگ مرمر سے انتہائی خوبصورت جالی دار 8 فٹ اونچا چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ اس میں چھت نہیں ہے۔ لیکن یہ مجر محمد شاہ بادشاہ کے مجر سے 4 فٹ اونچی بنیاد پر بنا ہے جس کی لمبائی 20 فٹ اور چوڑائی 16 فٹ ہے۔ اس مجر میں بھی محمد شاہ کے مقبرے کی طرح نقش نگاری سفید سنگ مرمر پر کرائی گئی ہے۔ اس مجر کے مشرقی اور مغربی حصے میں آمنے سامنے دو دروازے ہیں، لیکن مشرقی طرف کے دروازے میں اب کواڑ نہیں ہے لیکن سنگ مرمر کی چوکھٹ میں دھات کے بنے کلابے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی کواڑ لگائے گئے تھے۔ اس کے مغرب طرف کے دروازے میں لگا سنگ مرمر کا کواڑ ابھی محفوظ ہے۔ ان دونوں داخلے کے دروازے کے دونوں طرف دو حصوں میں جالیاں بنی ہوئی ہیں لیکن مشرقی طرف کی ایک جالی ٹوٹ گئی ہے۔ اس مقبرے کے چاروں کناروں پر خوبصورت برجیاں بنی ہیں۔ اس مجر میں چار قبریں ہیں۔ بشیر الدین احمد کے مطابق دیوار سے لگی ہوئی قبر اکبر شاہ ثانی (1806-1837 عیسوی) کے بیٹے مرزا بابر کی ہے، جس پر کسی میر محمدی کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس کے مشرقی جانب کی قبر مرزا جہانگیر کی ہے، جس پر کسی عورت کا تعویذ اکھاڑ کر یہاں لگا دیا گیا ہے۔ مزید قبروں کی پہچان نہیں ہو سکی ہے[22]۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا نے جہاں آرا بیگم اور محمد شاہ اور مرزا جہانگیر ان تینوں مجر کی ٹوٹی ہوئی جالی، پراپیٹ اور برج کو مرمت کر کے از سر نو لگانے کا کام کیا ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے احاطے سے باہر سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے، جس میں لگے کتبے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مقبرہ ایک عورت ''کوکلدی بائی'' کا ہے۔ جس کی وفات 948 ہجری بمطابق 1538 عیسوی میں ہوئی اور اس مقبرے کی تعمیر 1080 ہجری بمطابق 1670 عیسوی میں کی گئی۔ یہ عورت کون تھی؟ اس کا تعلق کس سے تھا؟ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ اندازہ یہ ہے کہ یہ عورت اپنے وقت کی قابل قدر عورت رہی ہوگی۔ تبھی اسے شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے قریب دفنایا گیا ہے اور اس کی وفات کے 135 سال بعد مقبرے کی تعمیر

بھی بڑے ہی خوبصورت انداز سے کروائی گئی ہے۔ اس مقبرے میں اللہ کے 99 نام بڑے ہی خوشنما انداز سے کندہ کئے گئے ہیں۔ قبر خالص سنگ مرمر کی ہے۔ لیکن یہ مقبرہ اب رہائش کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی حالت قابل رحم ہے۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ کیونکہ یہ ایک انمول عمارت ہے جس کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔[23]

درگاہِ شاہِ مرداں سے عقیدت

دہلی میں جور باغ روڈ کے مشرق کی طرف کربلا روڈ ہے۔ کربلا روڈ جہاں ختم ہوتی ہے، وہیں پر درگاہِ شاہِ مرداں ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاہِ مرداں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ درگاہِ شاہِ مرداں کی اہمیت یہ ہے کہ اس مقام پر حضرت علی کے قدم مبارک کا نقش ایک سنگ مرمر کے حوض میں محفوظ کیا گیا ہے۔ دوسری طرف اسی مقام پر پیغمبر حضرت محمد کی پیاری صاحبزادی فاطمہ زہرٰی کا پیالہ جو پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس کو ایک برج کے اندر محفوظ کیا گیا تھا۔ جو بی بی فاطمہ کی چکی کے نام سے مشہور ہے۔ ان ہی دو وجوں سے شاہِ مرداں کی اہمیت مغل دور میں بہت زیادہ تھی اور اس کی عقیدت میں یہاں بہت سارے تعمیری کام کئے گئے۔ شاہ مرداں کے قریب باغ، حوض مسجد، مقبرہ، مزار اور متعدد نوعیت کے تعمیری کام ہوئے۔ لیکن اب ان تمام تعمیری کام کے آثار مٹ چکے ہیں۔ 1947 عیسوی میں ہندو پاکستان کی تقسیم کے بعد پاکستان سے آئے ہوئے پناہ گزیں نے ان ساری عمارتوں اور شاہ مرداں کی وسیع چہار دیواری توڑ کر اپنے رہنے کے لئے گھر بنا لئے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں کہ مغل بادشاہ محمد شاہ (1719-1748 عیسوی) کی بیوی ادہم بائی تھی۔ جسے محمد شاہ کے بیٹے (1748-1754) کے زمانے میں، اسے نواب بائی اور نواب قدسیہ کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ 1724 عیسوی میں اس کے پاس یہ قدم شریف کا پتھر آیا اور وہ اس قدم شریف کے نقش کو ایک سنگ مرمر کے حوض میں محفوظ کروا دیا۔ اسی کے ساتھ اس درگاہ کی اہمیت بڑھتی گئی۔ یہاں متعدد تعمیری کام ہوئے۔[24]

پیغمبر حضرت محمد کی پیاری بیٹی فاطمہ زہرٰی کا پیالہ بھی اسی دور میں آیا اور اسے بھی نواب قدسیہ نے ایک حوض بنا کر اس میں محفوظ کر دیا۔ جو بی بی فاطمہ کی چکی کے نام سے مشہور ہوئی۔ خلیق انجم لکھتے ہیں کہ درگاہِ شاہِ مرداں 1724 عیسوی میں نہیں بنی تھی۔ اس جگہ کی اہمیت پہلے بھی

تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہِ جہاں کے دور میں محابت خان کی وفات جب 1635 عیسوی میں ہوئی تو اس کی وصیت کے مطابق اُسے دکن سے دہلی لا کر درگاہ شاہ مرداں میں دفنائی گئی۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ جہاں سے قبل دہلی میں درگاہ شاہ مرداں کی تعمیر ہو چکی تھی اور یہاں قدم شریف موجود تھا[25]۔

مغل بادشاہ محمد شاہ (1719-1748 عیسوی) کی بیوی نواب قدسیہ نے احمد شاہ (1748-1754 عیسوی) کے دور میں یعنی 1748ء میں درگاہِ شاہ مرداں کے چاروں طرف چہار دیواری اور اس کے اندر ایک مجلس خانہ، ایک مسجد اور ایک حوض کی تعمیر کرائی[26]۔

1821 عیسوی میں مغل بادشاہ اکبر ثانی (1806-1837 عیسوی) کے دورِ حکومت میں صادق علی خان نے ایک نقار خانہ کی تعمیر کرائی[27]۔ سن 1808 عیسوی میں درگاہ شاہ مرداں میں عشرت علی خان نے ایک مجلس خانہ کی تعمیر کرائی[28]۔

سید عارف علی شاہ، جن کی وفات 1661 عیسوی میں ہوئی۔ انہیں درگاہ شاہ مرداں میں دفنایا گیا اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ان کی درگاہ بنائی گئی۔ آج بھی یہ درگاہ اپنی محفوظ حالت میں موجود ہے۔ جہاں عقیدت مندوں کا آنا جانا ہمیشہ رہتا ہے۔ جب نواب قدسیہ کی وفات ہوئی تو، اسی مقام پر اس کو درگاہ شاہ مرداں کے قریب دفنایا گیا۔ آج بھی اس کا مقبرہ صحیح حالت میں ہے[29]۔

صفدر جنگ کا مقبرہ 1753ء میں درگاہ شاہ مرداں کے قریب قدم شریف کی عقیدت میں قائم کیا گیا تھا۔ صفدر جنگ کے بھائی کے سالے مرزا نجف خاں بہادر کی وفات ہوئی تو انہیں 1780 عیسوی میں درگاہ شاہ مرداں میں لا کر دفنایا گیا[30]۔

درگاہِ شاہ مرداں، شیعہ مسلک سے منسلک لوگوں کے لئے خاص اہمیت رکھنے والی درگاہ ہے، لیکن سنی مسلک کے لوگ بھی درگاہ شاہ مرداں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے مغل خاندان کے لوگ جو سنی تھے، درگاہ شاہ مرداں کے احاطے میں دفن ہوئے۔ اس درگاہ کے احاطے میں مغلوں نے اپنی ایک الگ قبرستان بنائی تھی، جہاں وہ دفن ہوتے تھے۔ مرزا سنگین بیگ کے مطابق شاہ عالم ثانی کی بیٹی، ان کی پوتی اور نتی کی قبریں شاہ مرداں میں ہیں۔ اکبر ثانی کی ماں نواب مبارک محل بیگم کا مقبرہ بھی یہیں ہے[31]۔ اس طرح مغل خاندان کی قبریں

درگاہ میں بے شمار ہیں۔لیکن کتبہ ٹوٹ پھوٹ جانے کے سبب انکی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔

درگاہِ شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی سے عقیدت

شیخ نصیرالدین محمود چراغ دہلی کی درگاہ کے احاطے میں مغل بادشاہ فروخ سیر (1713-1719) کے دورِ حکومت میں ایک مسجد کی تعمیر کی گئی جو آج بھی محفوظ ہے۔محمد شاہ (1719-1748 عیسوی) نے 1729 عیسوی میں چار لاکھ روپئے خرچ کر کے درگاہ کے چاروں طرف شاندار طریقے سے چہار دیواری بنوائی۔جس میں داخلے کے لئے استقبالیہ دروازے کو نہایت ہی شاندار طریقے پر بنائے گئے اور چاروں کناروں پر خوبصورت چھتری تعمیر کی گئی،لیکن بدقسمتی سے اب یہ سب محفوظ نہیں رہے۔1947 عیسوی میں ملک کی آزادی اور پھر ملک کی تقسیم نے اس درگاہ کے حُسن کو ختم کر ڈالا۔درگاہ کی اس خوبصورت چہار دیواری کو توڑ دی گئی،لیکن دو برجیاں اور داخلہ دروازے،گھروں اور مکانوں میں دبے آج بھی اپنے حسن و جمال کی منہ بولتی تصویر ہیں[32]۔

حوالہ جات

1. سید اطہر عباس رسوی، فتح پور سکری، نئی دہلی، (1992)، صفحہ نمبر 60
2. سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ نمبر 341
3. ایضاً، صفحہ نمبر 322
4. ایضاً، صفحہ نمبر 340
5. سید اطہر عباس رضوی، فتح پور سکری، نئی دہلی، (1992)، صفحہ نمبر 61
6. سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ نمبر 341
7. ایضاً، صفحہ نمبر 322
8. ایضاً، صفحہ نمبر 343
9. ایضاً، صفحہ نمبر 345
10. ایضاً، صفحہ نمبر 344
11. ایضاً، صفحہ نمبر 322
12. ایضاً، صفحہ نمبر 353

13. ایضاً، صفحہ نمبر 335
14. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 385
15. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 329
16. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 330
17. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 369
18. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 329
19. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 322
20. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 322
21. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 385
22. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 386
23. ایضاً، جلد 3، صفحہ نمبر 394
24. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 359
25. خلیق انجم، درگاہ شاہ مرداں، نئی دہلی، (اردو)، (1992)، صفحہ نمبر 40
26. سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو) نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ نمبر 360
27. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 359
28. خلیق انجم، درگاہ شاہ مرداں، نئی دہلی، (اردو)، (1992)، صفحہ نمبر 100
29. سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو) نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ نمبر 76
30. ایضاً، جلد 1، صفحہ نمبر 365
31. خلیق انجم، درگاہ شاہ مرداں، نئی دہلی، (اردو)، (1992)، صفحہ نمبر 25
32. سرسید احمد خان، آثار الصنادید، (اردو)، نئی دہلی، (1992)، جلد 1، صفحہ نمبر 326

☆☆☆

دسواں باب

ہندوستانی معاشرے میں درگاہوں کی اہمیت اور ان کے اثرات

صوفیاء کرام کی درگاہوں سے عقیدت

ابتداء سے ہی ہندوستانی معاشرے میں یہ عقیدہ قائم تھا کہ اللہ کے ولی مرتے نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمارے درمیان سے چلے جاتے ہیں۔ انتقال کے بعد بھی ان کا کارنامہ جاری رہتا ہے۔ ان صوفیاء کرام کی زندگی میں، جو خوبیاں اور خصوصیتیں ہوتی تھیں، وہ ان کی وفات کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ جیسا کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری اپنی زندگی میں غریبوں اور پریشان حالوں کی مسیحا کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، ان کی وفات کے بعد بھی ان کی یہ خوبیاں باقی رہیں اور آج بھی پورے ہندوستان میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، ''غریب نواز'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے در پر مدد مانگنے کی روایت آج بھی برقرار ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ نظام الدین اولیاء کی زندگی میں ان کی خانقاہوں میں عقیدتمندوں کی جتنی بھیڑ لگی رہتی تھی، ان کی وفات کے بعد بھی ان کی قبر پر عقیدت مندوں کی بھیڑ، انکی زیارت کے لئے اتنی ہی لگی رہتی تھی اور آج بھی اتنی ہی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اس طرح ہندوستان میں جتنے بھی صوفیاء کرام ہوئے، ان کی زندگی میں ان کا جتنا احترام اور جتنی عقیدت تھی اور انہیں جتنی شہرت ملی ہوئی تھی، آج بھی لوگ ان کی زیارت کے لئے ان کی قبر پر اتنی ہی عقیدت

کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔

عہدِ وسطیٰ میں ان درگاہوں کی خاص اہمیت تھی۔ مرقع دہلی کے مطالعہ سے ان درگاہوں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی درگاہ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس مقام کی پاکیزگی اور یہاں کی روحانیت جنت کی رغبت پیدا کرتی ہے۔ صبح کے وقت سکون دینے والی اور خوشگوار ہوائیں چلتی ہیں، لوگ درگاہ کی زیارت کے لئے ہر روز جاتے ہیں۔ لیکن جمعہ کو یہاں خاص طور پر بھیڑ ہوتی ہے۔ درگاہ کی زیارت کے بعد لوگ درگاہ کے قریب قائم عمارتوں کو گھوم گھوم کر دیکھتے ہیں اور حوض شمسی پہنچ کر روحانی سکون پاتے ہیں۔ اس درگاہ کے قریب بے شمار بادشاہوں، شہزادے اور امراء کی قبریں ہیں، جو بڑے خوش نصیب تھے کہ انہیں اس مقام پر دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ 16 ربیع الاول کو یہاں عرس ہوتا ہے اور بیشمار لوگ حاضر ہوتے ہیں اور دو دنوں تک یہاں قیام کرتے ہیں[1]۔

شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے بارے میں مشہور ہے کہ بادشاہ اور امراء شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی زیارت کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ ان کی زیارت سے ہی ان کی ساری خواہشیں پوری ہو جاتی تھیں۔ خاص طور پر صفر کے مہینے کے آخری بدھ کو یہاں پر لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ دہلی والے بہت سج دھج کر آتے ہیں، زیارت کرتے ہیں اور درگاہ کے چاروں طرف لگے باغ میں ٹہلتے ہیں۔ یہاں پر ہر طرح کی دکانیں لگتی ہیں۔ قوالی ہوتی ہے۔ عرس 14 ربیع الاول کو ہوتا ہے، جس میں چوبیس گھنٹے قوالی ہوتی ہے۔ بہت سارے لوگ پوری رات جاگ کر عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں۔ قبر کو چومنے میں لوگوں کی خاص دلچسپی ہوتی ہے اور اس کے لئے خود کو بڑی قسمت والا سمجھتے ہیں[2]۔

شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی درگاہ کی اہمیت کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی، نہ صرف دہلی کے، بلکہ پورے ہندوستان کے چراغ ہیں۔ جن کی درگاہ کی زیارت کے لئے پورے ہندوستان سے لوگ آتے ہیں۔ اتوار کے دن خاص طور سے بھیڑ ہوتی ہے۔ دیوالی کے مہینے میں خصوصی طور سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ یہاں زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔ اس درگاہ کے قریب پانی کا ایک سوتا ہے، جہاں لوگ غسل کرتے ہیں جواب نہیں ہے۔ اس پانی سے

غسل کرنے والوں کی پرانی سے پرانی بیماری ٹھیک ہو جاتی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس درگاہ کی زیارت کرنے آتے ہیں[3]۔

سید حسن رسول نما کی درگاہ کی اہمیت کے سلسلے میں مشہور ہے کہ اس درگاہ کا ماحول اتنا خوشنما ہے کہ یہ جنت کی مثال ہے۔ لوگ یہاں بڑی ہی عقیدت اور آرزوؤں کے ساتھ آتے ہیں۔ ان کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ہمیں پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی زیارت خواب میں نصیب ہو جائے۔ ایسی خواہش رکھنے والوں کی خواہش پوری ہوتی ہے۔ شعبان کے مہینے میں عرس لگتا ہے، جس میں بہت دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اس عرس میں بہت بھیڑ ہوتی ہے[4]۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور حکمرانوں میں ان درگاہوں کا خاص وقار و مقام تھا۔ دہلی سلطنت کے حکمراں ان درگاہوں پر حاضری دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ مغل دور کے آخری وقت میں ان درگاہوں کی اہمیت اور وقار میں بہت اضافہ ہوا۔ ہر بادشاہ ان درگاہوں سے عقیدت رکھنے لگے اور اپنے روحانی سکون کا مرکز ان درگاہوں کو ہی بنایا۔ یہاں تک کہ وفات کے بعد اپنی آخری آرام گاہ ان درگاہوں کو بنایا۔ ان حکمرانوں کا یہ یقین تھا کہ اللہ کے ولی کے آستانے یعنی ان درگاہوں سے تعلق رکھنے سے آخرت میں سکون نصیب ہوگا۔

ہندوستانی معاشرہ میں ان درگاہوں کی خاص اہمیت ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں سے بھی مذہب کے لوگ محبت رکھتے ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھی مذہب کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ جہاں ان کو روحانی سکون اور چین نصیب ہوتا ہے۔ آستانے پر پھول اور خوبصورت، قیمتی چادر چڑھا کر عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ گھر سے لذیذ کھانا بنا کر اور میٹھی چیزیں لاتے ہیں اور غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کرتے ہیں۔ ان درگاہوں سے جڑے بے شمار فقیر اور بے سہارا لوگوں کا گذر بسر ان ہی کھانوں سے ہوتا ہے۔ ان درگاہوں میں نذرانے کے اتنے پیسے آتے ہیں کہ یہاں کے سجادہ نشیں اور خادم پُرسکون زندگی گزارتے ہیں۔

ہندوستانی معاشرے میں، یہ درگاہیں پورے سماج کے روحانی علاج کے مرکز کے طور پر کام کر رہی ہیں، جہاں سماج کے ہر پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جادو ٹونا، سحر اور شادی کے مسائل کے حل کے لئے دعا اور تعویذ دیے جاتے ہیں۔ جس سے لوگوں کو اپنے مسائل سے نجات ملتی ہیں اور لوگ مختلف مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستانی سماج میں درگاہ کے فنِ تعمیر کی اہمیت

ہندوستانی معاشرے میں درگاہ تعمیر کرنے کا کام خاص طور سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستان میں بہت سے مشہور صوفی ہوئے لیکن ان ہی صوفیاء کی شہرت باقی رہی، جن کی قبروں پر تعمیری کام کیے گئے۔ ایسے صوفیاء کا نام آج ہندوستان کے سماج میں باقی ہے۔ البتہ جن صوفیاء کی قبر پر درگاہ تعمیر نہیں کی گئی، آج ان کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔ وہ صرف تاریخ کے صفحوں میں ہی اپنا مقام بنا سکے۔ سماج میں ان کی بزرگی کی اہمیت اور ان کی سیرت بدلتے وقت میں گم ہو گیا۔ خاص طور پر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ہندوستانی سماج میں ان ہی درگاہوں کو اہمیت دی گئی جن درگاہوں سے سلطانوں اور بادشاہوں نے دلچسپی لی۔ جیسا کہ دہلی میں تعمیر شدہ درگاہوں کی صورت حال کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی درگاہوں سے سلطانوں اور بادشاہوں کو دلچسپی تھی۔ ان درگاہوں کی تعمیر میں حکمرانوں نے دلچسپی لی، وہی درگاہیں بنیادی طور سے ہندوستانی سماج میں کافی اہمیت حاصل کر سکیں۔

اسی دہلی میں شیخ ابو بکر طوسی حیدری قلندر جیسے عالم بزرگ جن سے ملنے شیخ نظام الدین اولیاء جایا کرتے تھے۔ ان کی درگاہ کی تعمیر میں سلطانوں اور بادشاہوں نے دلچسپی نہیں لی اور نہ ان کی درگاہوں کو اتنی اہمیت دی۔ جبکہ یہ صوفی شیخ نظام الدین اولیاء کے دور کے مشہور صوفی مانے جاتے تھے۔ آج ان کی درگاہ ہندوستانی سماج میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکی، جو مقام شیخ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کو ملا۔ اسی طرح شیخ شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی اور شاہ ولی اللہ جیسے مشہور عالم صوفی کی قبر پر عالیشان درگاہ قائم نہیں ہونے کے سبب ہندوستانی سماج میں وہ مقام نہیں مل سکا جو شیخ نظام الدین اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کی درگاہ کو ملا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیاء کی شہرت اور ان کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں درگاہ میں تعمیری فن کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ شیخ سلیم چشتی کی شہرت ان کی خوبصورت درگاہ کے سبب ہوئی۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ شیخ ابو بکر طوسی حیدری عرف منکا پیر (پرگتی میدان) کی درگاہ کی تعمیر ہونے کے سبب وہاں عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن ٹھیک ان کے سامنے مغرب کی طرف سڑک کی دوسری جانب شیخ نورالدین ملک یار پراں کا مزار ہے، جس پر کوئی تعمیری کام نہیں ہوا ہے۔ یہ اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور بزرگ تھے، لیکن ان کی قبر پر تعمیری کام نہ ہونے کے سبب، انہیں بہت

کم لوگ جانتے ہیں، نیز ان کے مزار پر کم لوگ پہنچتے ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی میں جن صوفیاء کی درگاہ، خوبصورت، شاندار اور دلکش ہے زیادہ تعداد میں لوگ وہاں جاتے ہیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

حوالاجات

1. نواب قلی خان، مرقع دہلی، اردو ترجمہ خلیق انجم، دہلی، (1993)، صفحہ نمبر 117
2. ایضاً، صفحہ 118
3. ایضاً، صفحہ نمبر 120
4. ایضاً، صفحہ نمبر 122

گیارہواں باب

تصوف اور صوفیاء کرام سے مسلمانوں میں اختلاف کے اسباب

علماء اور صوفیاء کے اختلاف اور اس کے اسباب

زمانہ وسطیٰ میں دہلی سلطنت سے مغلوں کے زمانہ تک (تیرہویں صدی عیسوی سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک) پورے ہندوستان میں صوفیاء کی بالا دستی قائم رہی۔ علما طبقہ ہمیشہ صوفیاء سے حسد کرتا رہا، وجہ یہ تھی کہ صوفیاء کی پکڑ پورے ہندوستانی سماج پر تھی، چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، عورت ہو یا مرد، سادھو ہو یا فقیر، سب صوفیہ کی خانقاہ میں موجود ہوتے تھے۔ اور یہ صوفیاء حضرات سبھی کے ساتھ بلاامتیاز یکساں معاملہ کرتے تھے۔ ان کی خانقاہوں میں سبھی مذاہب اور فرقہ کے لوگ ہوتے تھے۔ ہندوستان میں خانقاہ ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں سبھی مذاہب اور فرقے کے لوگ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان، سادھو ہو یا فقیر، سپاہی ہو یا وزیر سب کے سب ایک ساتھ بیٹھتے تھے، یہاں کسی طرح کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہوتا تھا۔ روزانہ ان صوفیاء کی خانقاہوں میں لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

اسی بھیڑ کو دیکھ کر سلطان ہمیشہ خوفزدہ رہتے تھے کہ ان صوفیا کی خانقاہوں میں سبھی طبقوں کے علاوہ ہمارے سپاہی اور وزیر بھی موجود رہتے ہیں۔ یہ صوفیاء کبھی بھی ہماری سلطنت کا تختہ پلٹ سکتے ہیں۔ ایک بار سلطان غیاث الدین بلبن کی خانقاہ میں پہنچا اور وہاں لوگوں کے جمگھٹ

کو دیکھا تو کہا کہ سچائی تو یہ ہے کہ ہندوستانی سماج پر تو حکومت ان صوفیاء کی ہے، میری حکومت تو صرف ایک مخصوص طبقہ تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سلطان کی سلطنت پر صوصوفیاء کا دبدبہ بنا رہا۔ صوفیاء نے سلطنت سے اپنا تعلق نہیں رکھا اور نہ کبھی سلاطین کے دربار میں گئے اور نہ ان کے نذرانوں کو قبول کیا۔ حکومت کے کام کاج سے ہمیشہ اپنے کو دور رکھا لیکن سلطان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کیلئے ان صوفیاء نے ہر سیاسی مرکز کو ہی اپنا مرکز بنایا۔ جس طرح زمانہ وسطیٰ میں ہر سلطان نے دلی کو اپنا سیاسی مرکز بنایا اور یہیں سے سارے ہندوستان پر حکومت کرتے تھے ٹھیک اسی طرح صوفیاء نے بھی دلّی کو ہی اپنا مرکز بنایا اور یہیں سے پورے ہندوستان میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے کام کیا۔

کوئی بھی سلطان یا بادشاہ ان صوفیاء سے ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ان سے ٹکرانے کا مطلب ہے سلطنت کی تباہی۔ لیکن علماء جو دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، ہندوستانی سماج اور سلطان کی نظر میں وہ عزت اور مقام نہ پاسکے جو صوفیاء کرام کو حاصل تھا، یہی وجہ تھی کہ علماء ان سے حسد کیا کرتے تھے اور اس تاک میں رہا کرتے تھے کہ کسی بھی طرح ان صوفیاء کے کام اور سلوک [illegible] سب ٹھہرا کر انہیں ذلیل کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے سلطان کو ہمیشہ صوفیاء کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی اور کبھی کبھار وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

غیاث الدین بلبن کے زمانے میں 'سیدی مولا' نام کے ایک مشہور صوفی بزرگ تھے جن کی خانقاہ میں ہزاروں لوگ روزانہ کھانا کھایا کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں ہر وقت لنگر چلتا رہتا تھا۔ ان کی شہرت کو دیکھ کر درباری علماء نے سلطان سے کہا کہ یہ لوگوں کو سلطنت کے خلاف بھڑکا رہے ہیں، اور ان کی خانقاہی بھیڑ سے سلطنت کو کسی بھی وقت خطرہ پہنچ سکتا ہے۔ آخر ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے۔ اتنے پیسے تو سلطنت کے پاس بھی نہیں ہیں کہ ہر دن ہزاروں لوگوں کو کھلایا جاسکے۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین بلبن نے ان درباری علماء کے بہکاوے میں آکر سلطنت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں 'سیدی مولا' کو ہاتھی سے کچلوا دیا۔ 'سیدی مولا' کے انتقال کے بعد آسمان کالا ہو اٹھا اور دلّی میں دو سال تک ایک بوند بھی بارش نہیں ہوئی، قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکے مرنے لگے۔

اسی طرح سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان المشائخ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے درمیان علماء نے جھگڑا پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن علاء الدین خلجی یہ سمجھتا تھا کہ یہ علماء شیخ سے جھگڑا کرا کر ہماری سلطنت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس نے ایسی غلطی نہیں کی۔ لیکن اس کا جانشین قطب الدین مبارک شاہ خلجی (1316-1320ء) جو ایک نوجوان بادشاہ تھا درباری علماء کے بہکاوے میں آ کر شیخ نظام الدین اولیاء سے الجھ گیا۔ ہوا یوں کہ سلطان کے دربار میں نیا چاند دیکھنے کی خوشی کے موقع پر شہر کے تمام علماء، صوفیاء اور امراء اسے نیا چاند دیکھنے کی مبارک باد دینے جایا کرتے تھے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء دربار میں کبھی نہیں جاتے تھے۔ بلکہ اپنی طرف سے اپنے ایک خادم کو بھیج دیا کرتے تھے۔ اس بات کی شکایت درباری علماء نے سلطان سے کی کہ شیخ نظام الدین اولیاء اپنے کو سلطان سے بھی اوپر سمجھتے ہیں، کبھی سلطان سے ملنے یا ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو مبارک باد دینے نہیں آتے، اپنی جگہ ایک غلام کو بھیج دیتے ہیں۔ علماء کی شکایت پر سلطان قطب الدین خلجی نے شیخ نظام الدین اولیاء کے پاس یہ حکم نامہ لکھ کر بھیجا کہ اس مہینے کا نیا چاند دیکھنے کے موقع پر پہلی تاریخ کو دربار میں ضرور موجود ہوں، ورنہ ہم جیسے چاہیں گے آپ کو بلوالیں گے۔ اس حکم نامہ کو سن کر دلی کے بڑے بڑے صوفیاء آئے اور شیخ نظام الدین اولیاء کو سمجھایا کہ سلطان نوجوان ہے اور کم عقل ہے، اس لئے آپ دربار میں حاضر ہو جائیں، ورنہ اگر وہ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر آپ کو ایک قیدی بنا کر دربار میں حاضر کرے گا تو ہم سب کی توہین ہوگی۔ یہ سن کر شیخ نظام الدین اولیاء خاموش رہے اور کہا "دیکھئے اللہ کی طرف سے کیا ظہور آتا ہے"۔ لوگ یہ سمجھے کہ یہ دربار میں پہنچنے کے لئے راضی ہو گئے۔ لیکن شیخ نظام الدین اولیاء نے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہم کسی بھی حالت میں سلطان کے دربار میں حاضر نہیں ہوں گے۔ چاند کی ۲۹ تاریخ کو رات میں اپنی ماں کے مزار پر پہنچے اور کہا "اے میری ماں! میں تجھ سے بہت پیار کرتا ہوں، سلطان نے ہمیں دربار میں حاضر ہونے کی دھمکی دی ہے، اگر وہ اپنے اس قول میں کامیاب ہو گیا تو اب میں آپ سے ملنے کبھی نہیں آؤں گا" اتنا کہہ کر شیخ نظام الدین اولیاء اپنی خانقاہ میں لوٹ آئے۔ چاند کی ۲۹ تاریخ کے رات میں جب سلطان سو رہا تھا تو اس کے وزیر اعظم خسرو نے اس کا سر کاٹ کر قلعے کے باہر پھینک دیا۔ اس طرح سلطان نیا چاند نہیں دیکھ سکا اور شیخ نظام الدین اولیاء اس کی توہین سے بچ گئے۔

سلطان فیروز شاہ تغلق (1351-1387ء) کے زمانے میں دلی میں 'احمد بہاری' نام کے ایک صوفی بزرگ تھے، جن کی خانقاہ دلی میں خاص طور سے مشہور تھی۔ان کی خانقاہ کا لنگر ہمیشہ چلتا رہتا تھا، ہزاروں لوگوں کو یہاں ہر روز کھانا ملتا تھا۔ان کی خانقاہ میں لگی بھیڑ اور ان کی شہرت دیکھ کر علماء حسد کرنے لگے اور فیروز شاہ تغلق سے یہ شکایت کی کہ احمد بہاری کی خانقاہ میں روز ہزاروں لوگوں کو کھانا ملتا ہے اور وہ انا الحق یعنی خود کو خدا کہتے ہیں۔سلطان نے احمد بہاری کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا، اور درباری لوگوں نے کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں قتل کرا دیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع مشہور صوفی شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کو ملی تو انہیں دلی تکلیف پہنچی اور وہ دلی آئے اور سلطان فیروز شاہ تغلق سے کہا کہ آپ احمد بہاری کو نہیں پہچان سکے کہ اللہ سے ان کا کتنا گہرا تعلق تھا۔یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے بھی ایک قدم آگے تھے اور کہا کہ اب آپ کی سلطنت محفوظ نہیں رہ سکتی ہے، اللہ ایسی سلطنت کو جلد ہی ختم کر دیتا ہے۔شیخ شرف الدین احمد منیری نے تغلق خاندان کی حکومت کے زوال کی پیشن گوئی کر دی اور جب فیروز شاہ تغلق کے بعد اس کا لڑکا گدی پر بیٹھا تو دہلی پر تیمور لنگ نے حملہ کر دیا اور ہمیشہ کے لئے تغلق خاندان ختم ہو گیا اور دہلی پر سید خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔

اورنگ زیب کے زمانے میں داراشکوہ کے گہرے دوست شاہ سرمد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ننگے بیٹھے رہتے تھے۔دلی کی عوام ان کی معتقد تھی۔درباری علماء نے اورنگ زیب کو شاہ سرمد کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔پہلے تو یہ کہا کہ شاہ سرمد داراشکوہ کے گہرے دوست ہیں اور یہ دہلی کی عوام سے مل کر حکومت کے خلاف بغاوت کرا سکتے ہیں۔دوسری شکایت یہ کی کہ شاہ سرمد ہمیشہ بغیر کپڑوں کے رہتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔ان دونوں باتوں پر اورنگ زیب نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔اس کے بعد علماء نے ایک نیا منصوبہ بنایا اور اورنگ زیب سے کہا کہ شاہ سرمد اسلام کا پورا کلمہ نہیں پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتے ہیں۔یہ ایک عجیب سی بات ہے۔اورنگ زیب نے شاہ سرمد کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔شاہ سرمد اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوئے۔علماء نے ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا انھوں نے اپنی عادت کے مطابق 'لا الٰہ' کہا۔علماء نے کہا پورا کلمہ پڑھو ورنہ کفر کا فتویٰ دے کر تمہیں قتل کروا دیا جائے گا۔شاہ سرمد نے کہا کہ میں ابھی پورا کلمہ پڑھنے کے لائق نہیں بنا ہوں، ابھی حالتِ نفی میں ہوں، اس لئے

میں ابھی اسے کیسے پورا کر سکتا ہوں، جو صحیح طور سے عمل میں نہیں آپایا ہے اسے میں اپنی زبان سے کیسے کہہ سکتا ہوں اگر پورا کلمہ پڑھوں گا تو جھوٹ ہو جائے گا۔ اس بات پر علماء چلّا اٹھے، تم کافر ہو۔ سرمد پر کفر کا فتویٰ لگا کران پر قتل کا حکم جاری کر دیا۔ شاہ سرمد کو 1659ء میں جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے قتل کر دیا گیا۔ ان کا سر جسم سے الگ ہوتے ہی تین بار پورا کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھا اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر ان کے استاد ہرے بھرے شاہ نے شاہ سرمد کو وہیں رکنے کا حکم دیا، ان کا کٹا سر وہیں رک گیا، اور ٹھنڈا پڑ گیا، اس واقعہ کے بعد اورنگ زیب کو چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ زندگی دکن کی جنگ میں الجھا رہا اور 87 سال کی عمر میں دکن میں لڑتے لڑتے اس کا انتقال ہو گیا۔ دہلی کے تاج و تخت کا آرام اسے نصیب نہیں ہو سکا۔ اس کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت زوال شروع ہو گیا۔

علماء صوفیاء کے ساتھ ایسا کس لئے کرتے تھے؟ وجہ یہ تھی کہ وہ مسلم سماج پر اپنی پکڑ بنانا چاہتے تھے اور مسلم سماج پر صوفیاء کی پکڑ تھی۔ صوفیاء سلطنت سے تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے، ہمیشہ سلطان اور اس کے دربار سے دور رہتے تھے، جسکی وجہ سے علماء کو مختلف درباروں میں مذہبی مشیر کی حیثیت سے جگہ ملتی رہی، مسلم سماج پر علماء کی پکڑ نہیں تھی اور نہ ہی سلطان پر ان کا کوئی اثر تھا۔ صوفیاء دربار سے دور ہوتے ہوئے بھی سلطان کی نظر میں قابل احترام بنے رہے، اسی وجہ سے علماء صوفیاء سے حسد کرتے تھے۔

علماءِ دین علماءِ دنیا

علماء دو طرح کے تھے۔ 'علماء دین' جو دین کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کو گزارنا چاہتے تھے۔ ان کا ہر عمل دنیا پانے کے لئے نہیں بلکہ آخرت یعنی مرنے کے بعد والی زندگی کے نقطہ نظر ہوتا تھا۔ وہ اپنی نفسیاتی خواہشات کے مطابق کام نہیں کرتے تھے بلکہ اللہ کے حکم اور رسول کی سنت کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ ایسے علماء سلطان کی چاپلوسی سے دور رہے اور ان کے دربار سے خود کو دور رکھا، جیسے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ نظام الدین اولیاء، شیخ جمالی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی، خواجہ باقی باللہ، شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ اسماعیل دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، مولانا احمد

رضاء خاں قادری اور علی میاں ندوی وغیرہ یہ سبھی علمائے دین تھے جن کی پوری زندگی اسلام کی نشر واشاعت اور تقویٰ یعنی تصوف پر مبنی تھی۔

دوسرا گروہ علمائے دنیا کا تھا۔ جنہوں نے اپنا نفس، اور اپنا سارا علم دنیا پانے کے لئے لگا دیا۔ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے شریعت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا، غیر شرعی عمل کو بھی شرعی بتایا۔ سلطانوں اور بادشاہوں سے انعامات حاصل کرنے کیلئے ان کی مرضی کے مطابق شریعت کی تشریح کی۔ بادشاہ اور سلطان کے غیر شرعی کام کو شرعی بتایا اور اس کے بدلے اونچے مرتبے اور منصب حاصل کئے جس سے ان کو دولت اور زندگی کی ساری آسائشیں حاصل ہوگئیں، یہ گروہ ہمیشہ صوفیاء کے خلاف تھا اور تصوف کو غلط سمجھتا تھا۔

انگریزوں کے ذریعہ مسلمانوں کی مذہبی اورثقافتی تہذیب کا خاتمہ

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں نے کھل کر حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا، لاکھوں کی تعداد میں قتل کئے گئے، جن میں علماء اور صوفیاء کو انگریزوں نے بطور خاص نشانہ بنایا۔ مسلمانوں کے سبھی مذہبی اور تعلیمی مراکز چاہے وہ خانقاہ ہوں یا مدرسے زمین بوس کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کے چھ سو سالہ مذہبی وثقافتی نظام کو تہ و بالا کر ڈالا۔ نتیجتاً ہندوستان سے خانقاہی نظام ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ انگریز جانتے تھے کہ مسلمانوں کی روحانی پرورش خانقاہوں میں ہو رہی ہے جس کی وجہ سے بے شمار لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر انھیں ختم نہیں کیا گیا تو ہماری عیسائی مشنری ہندوستان میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ہے چنانچہ انگریزوں نے خانقاہی نظام کو ہمیشہ کے لئے ختم کر ڈالا۔

خانقاہوں کا زوال اور مدرسوں کا قیام اور مسلمانوں پر اس کے اثرات

انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں ہندوستان کے مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کے تئیں بیدار ہوئے اور دیوبند میں دارالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا گیا اور دوسرا مدرسہ دارالعلوم

ندوۃ العلماء کے نام سے لکھنؤ میں قائم کیا گیا۔ دھیرے دھیرے اس کے ساتھ اعظم گڑھ، سہارن پور اور دیگر مقامات پر مدرسے قائم کئے گئے، ان مدرسوں سے لاکھوں کی تعداد میں عالم، فاضل، قاری اور حافظ پیدا ہو رہے ہیں، لیکن یہاں سے نکلنے والوں کی عملی زندگی میں اسلامی تعلیمات یعنی تقویٰ کا رنگ نہیں جھلکتا ہے۔ ان کے اندر نہ تو دین کی سمجھ پیدا ہو رہی ہے اور نہ ہی ان کے اندر اعلیٰ اخلاق و کردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں یہاں کے کچھ طالب علم جو عالمیت کی سند حاصل کر کے دنیا کی طرف اس طرح مائل ہوئے کہ اپنا لباس اور اسلامی شناخت کو بدل ڈالا ڈاڑھی کرتا پائجامہ چھوڑ کر انگریزی لباس اختیار کر کے مختلف روزگار جیسے فلمی دنیا میں بھی جانے میں انہیں کوئی قباحت نہیں ہوئی۔ آخر ایسا کیوں؟ ایسا اس لئے کہ ان مدرسوں میں ایک اسکول کی طرح طے شدہ نصاب پڑھایا جاتا ہے اور سالانہ امتحان لے کر انہیں ڈگریاں دے دی جاتی ہیں۔ اس تعلیم کا اثر اس شخص کی زندگی پر پڑا کہ نہیں، وہ تعلیم کی روشنی سے منور ہوا کہ نہیں، اس کے کردار اور اخلاق میں اس تعلیم کا اثر ظاہر ہوا کہ نہیں، ان ساری باتوں کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جاتی بلکہ انھیں سالانہ نصاب پڑھا کر عالم، فاضل کی ڈگریاں دے کر انھیں فارغ کر دیا جاتا ہے۔

زمانۂ وسطیٰ کی خانقاہوں میں دی جانے والی تعلیم کا یہ مقصد نہیں تھا کہ انھیں طے شدہ نصاب پڑھا کر عالم، فاضل کی ڈگری دے کر انہیں فارغ کر دیا جائے۔ ان خانقاہوں میں دی جانے والی تعلیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو اسلام کی صحیح سمجھ آ جائے اور اسکی عملی زندگی اسلام کے مطابق ہو جائے، اس کے ہر عمل اور کردار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اخلاق و کردار دکھائی دے۔ جب تک یہ کیفیت خانقاہ کے طلباء میں نہیں پیدا ہوتی تھی اسے اسلام کی تعلیم دینے کا سرٹیفکٹ نہیں دیا جاتا تھا۔ مدرسے میں دی جانے والی تعلیم میں اخلاق و کردار اور اسلامی تہذیب و تمدن پر خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ اسکے برعکس خانقاہوں میں دی جانے والی تعلیم میں عملی پہلو پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی اور اس میں پختگی اور مضبوطی لانے کیلئے ایک لمبے عرصے تک محنت (ریاضت و مجاہدہ) کرائی جاتی تھی۔ صوفیاء کا ماننا ہے کہ اسلام کی تعلیم کیلئے ہمارے نبی نے کوئی ادارہ قائم نہیں کیا بلکہ اپنے عمل اور کردار سے قرآن کی تعلیم لوگوں تک پہنچائی۔ یہی وجہ ہے کہ خانقاہی نظام کی عملی تعلیم و تربیت زیادہ موثر ثابت ہوئی۔

اسی تعلیم کو لوگوں میں رائج کرنے کیلئے جگہ جگہ خانقاہیں قائم کی گئی تھیں۔ جہاں کے فارغ

خلیفہ اپنے کردار کے ذریعہ اسلام کے پیغام کو لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے

لیکن مدرسے کی تعلیم میں اس طرح کی کیفیت نہیں دکھائی دیتی ہے۔کیونکہ اسلامی تعلیم ایک طے شدہ نصاب پڑھ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام کی صحیح سمجھ پیدا کرنے اور عملی زندگی میں نافذ کرنے کا نام ہے۔ایک عالم ،اسلام کا محافظ اور نبی کا وارث ہوتا ہے جب تک اس کی عملی زندگی میں نبی کی سنت اور اسلام کی سمجھ نہ دکھائی دے وہ نبی کا وارث کیسے ہوسکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس طرح کے علماء جب مدرسوں سے پیدا ہوں گے تو اسلام کی تصویر کیا ہوگی؟ وہی ہوگی جو آج ہم سب دیکھ رہے ہیں،مسلمانوں میں ہر طرف پامالی ہی پامالی دکھائی پڑتی ہے۔ آج نہ ہماری عبادت میں تقویٰ ہے اور نہ عمل میں ایمانداری،آج نہ ہمارا اخلاق اچھا ہے اور نہ ہی کردار درست ہے۔اس سلسلے سے علامہ اقبال نے لکھا ہے کہ:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

خانقاھوں اورصوفیاء کرام کی شبیہ کوخراب کرنے میں درگاھوں کا رول

جب ہندوستان میں خانقاہوں کا زوال ہوا تو خانقاہوں کی جگہ درگاہوں نے لے لی۔ ہندوستان میں کچھ درگاہوں میں بیٹھنے والا مجاور اپنے آپ کو صوفی کہنے لگا،جس کا کام درگاہوں پر بیٹھ کر قبروں پر پھول اور چادر چڑھوانا اور لوگوں سے نذرانہ کی شکل میں پیسہ وصولنا ہے۔ دعا کرنے اور مرادیں پوری ہونے کے نام پر لوگوں سے پیسہ لینا اور ان پیسوں سے اپنا اور اپنے خاندان کی پرورش کرنا ہی ان کا اصل مقصد ہے۔کیا صوفیاء ایسے تھے؟ان کا طرز عمل ایسا ہی تھا؟نہیں بالکل نہیں۔یہ صوفیا اپنی خانقاہ کو چلانے کے لئے نذرانہ تو لیتے تھے،لیکن کسی سے مانگتے نہیں تھے یا مرادیں پوری ہونے کے لئے دعا کرنے کے نام پر پیسہ نہیں لیتے تھے۔ان کی خانقاہ میں آنے والے نذرانے کی رقم سے ہر وقت لنگر چلتا رہتا تھا ،جس سے ہزاروں غریبوں اور فقیروں کی پرورش ہوتی تھی۔اس پیسے سے صوفیاء کرام اپنا اور اپنے گھر والوں کی پرورش کا بندوبست نہیں کرتے تھے بلکہ سارا پیسہ خدا کے بندوں پر خرچ کردیتے تھے،اور اپنی ساری زندگی بندوں کی خدمت میں صرف کردیتے تھے۔انسانیت ان کا مذہب تھا۔لیکن ان درگاہوں پر بیٹھنے

والا مجاور جو اپنے آپ کو صوفی کہتا ہے اور لوگوں سے پیسے لیکر اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کرتا ہے۔ان کے اس عمل سے تصوف اور صوفیاء کرام کی شبیہ خراب ہوئی ہے اور اس سے لوگ صوفیاء کرام کے نیک عمل سے دور ہوتے چلے گئے ہیں اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ صوفیاء کرام انہیں کی طرح تھے۔ بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ موجودہ وقت کے مسلمان ان درگاہوں کو خانقاہ سمجھنے لگے ہیں اور درگاہ پر بیٹھے مجاور کو پیر سمجھنے لگے ہیں اس بات کو تصوف مخالف علماء نے بنیاد بنا کر تصوف اور صوفیاء کرام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا ہے اور لوگ تصوف اور صوفیاء کرام کی اصل تعلیمات سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔

تصوف اسلام کی روحانیت کا نام ہے

تصوف کوئی مذہب و مسلک یا مکتب فکر کا نام نہیں ہے جیسا کہ مختلف لوگوں نے اسے مذہب یا مسلک، یا مکتب فکر کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ تصوف اسلام کی روحانیت ہے جو چند مخصوص علماء کو اللہ نے اس نور سے نوازا، جس طرح سے قرآن کے نور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی زندگی نے پوری دنیا کو منور کر دیا اسی طرح تصوف کے نور نے امام غزالی، امام ابوحنیفہ، شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی، شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری، حضرت سید محمد گیسودراز، شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی، جیسے علمائے کرام کی زندگی کو دین حق سے منور کر دیا اور ان کی علمی کارنامے تصوف پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے ہی پوری دنیا میں قابل قدر ہوئے ہیں۔ تصوف ایک ایسی روحانیت سے بھرا لفظ ہے جو کسی بھی شخص کے دل میں یا اس کی عملی زندگی میں داخل ہونے کے بعد اسے نمایاں کر دیتا ہے جو بھی علمائے کرام تصوف کی طرف مائل ہوئے ان کی شخصیت نمایاں ہو گئی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ تصوف نے ہی مولانا روم کی مثنوی اور علامہ اقبال کی شاعری کو وہ مقام عطا کیا جو دیگر مفکر شاعر نہ پا سکے، اس طرح یہ واضح ہوتا ہے کہ تصوف اسلام کی اس روحانیت کا نام ہے جو کسی کے اندر پیوست ہو کر اس کا رنگ بدل دیتا ہے اور اس کی شخصیت پورے عالم میں ایک جداگانہ حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔

☆☆☆

بارھواں باب

ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں کا اسلامی نظریہ

اکیسویں صدی کے موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کا اسلامی نظریہ بالکل بدل چکا ہے، اسلام کے لیے جذبۂ قربانی اور اللہ کے بندوں سے محبت اور جانثاری کا جذبہ ان کے اندر سے ختم ہو چکا ہے، ان کا مذہب مادہ پرستی، مطلب پرستی اور خود غرضی پر مبنی ہے جو اسلام ہی نہیں بلکہ کوئی بھی مذہب اس طرح کی سوچ رکھنے اور عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو تہذیب وتمدن سے بھری ایک خوشحال سماجی زندگی تعمیر کرنے کی نظریہ کو زندگی میں قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے جس میں مادہ پرستی اور خود غرضی جیسی علامت کا کوئی گنجائش نہیں، وہ کہتا ہے کہ تمھیں جو کچھ بھی ملتا ہے وہ تمھارے مقدر سے ملتا ہے، کوشش سے نہیں، اگر کوشش سے ملنا ہوتا تو سبھی اپنی منچاہی زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور موجودہ مسلمان

☆ ”دنیاوی ساز و سامان اتنا رکھو جتنا کہ ایک مسافر اپنی سفر کے دوران اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے ساتھ رکھتا ہے“ لیکن آج کا مسلمان دنیاوی ساز و سامان حاصل کرنے میں زیادہ مصروف ہے۔

☆ ”اپنی مال اور دولت کو اسلام پر اور علم حاصل کرنے پر خرچ کرو“ لیکن آج کا مسلمان اپنا مال

اور دولت اپنی نفسیاتی خواہشات پر خرچ کرتا ہے۔

☆ ''اگر کسی مسلمان کے تکلیف و درد کو دیکھ کر ایک مسلم کا دل تڑپ نہ جائے وہ اس کے مدد کے لیے بے قرار نہ ہو جائے وہ مسلمان نہیں''۔ آج کے مسلمانوں کا دل کسی مسلمان کے تکلیف کو دیکھ کر نہیں تڑپتا ہے۔ اسے اپنے سے ہی فرصت نہیں تو دوسروں کیلئے اس کا دل کس طرح تڑپے گا۔

☆ ''دنیا کے مسلمان ایک جسم کے مانند ہیں اگر اس کے کسی حصے میں میں درد ہو تو اس درد کا احساس پورے جسم کو ہوتا ہے''لیکن آج کا مسلمان صرف اپنے لیے جیتا ہے، دوسرے سے اس کا کوئی مطلب نہیں۔

☆ ''ایک مسلمان کی عزت و مال ایک دوسرے مسلمان سے محفوظ ہو''۔ لیکن آج کے مسلمانوں سے ایک دوسرے مسلمان کی عزت اور مال محفوظ نہیں ہے۔ وہ ہر وقت اپنے مسلمان بھائی کی عزت و مال کو پامال کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔

☆ ''جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو یا مناسب سمجھتے ہو وہی دوسرے کے لیے بھی مناسب سمجھو''۔ لیکن آج کا مسلمان صرف اپنے فائدہ کی بات سوچتا ہے۔

☆ ''جو عمل دوسرے کا تمہیں برا لگتا ہے اس طرح کا عمل تم دوسرے کے ساتھ نہ کرو''لیکن موجودہ مسلمان اس کا خیال نہیں رکھتا ہے۔

☆ ''جو بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے پیار نہیں کرتا ہے وہ مسلمان نہیں''۔ لیکن آج کے معاشرہ میں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

☆ ''دنیا میں تمہیں دنیا پانے کے لیے نہیں بلکہ آخرت پانے کے لیے بھیجا گیا ہے''لیکن آج کا مسلمان دنیا حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

☆ ''کسی بیمار کی عیادت کرنا یا اس سے ملنے جانا سب سے بڑی عبادت ہے''۔ لیکن آج لوگ اپنی ماں باپ کی عیادت نہیں کرتے دوسروں کا خیال کیا کریں گے۔

☆ ''جب تمہاری بیٹیاں بلوغت تک پہنچیں تو ان کے لیے لڑکا دیکھنا شروع کر دو اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو فوراً ان کی نکاح کر دو اس میں تاخیر نہ کرو۔''لیکن آج کے مسلمانوں کو اس کی کوئی پرواہ نہیں، اپنی 20 سال کی لڑکی کو بچی سمجھتا ہے جبکہ حضرت عائشہ کی شادی 11 سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی اور وہ مکمل طور پر بالغ تھیں۔ لاکھوں لڑکیاں جن

کی عمر 35 پار کر چکی ہے بغیر نکاح اپنے گھروں میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ موجودہ دور میں شادی مشکل اور زنا کاری آسان ہوگئی ہے۔

☆ ''اسلام کی نظر میں وہی بڑا یعنی افضل ہے جس کے اندر تقوی اور پرہیز گاری ہے''۔ لیکن آج کے زمانے میں بڑا اور افضل وہ ہے جس کے پاس دولت اور طاقت ہے۔

اوپر بیان کی گئی پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر موجودہ مسلمان قائم رہنے میں ناکام ہیں اور اس طرح کا معاشرتی نظام بنالیا ہے کہ اسے اس پر قائم رہنا ممکن بھی نہیں ہے، پھر بھی اس دنیا میں اپنے آپ کو مسلمان بن کر دکھانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس نے ایک مستحکم راستہ چنا وہ یہ کہ تمام برائیاں کرتے رہو لیکن نماز پڑھتے رہو، مسجد کی تعمیر کثرت سے کرو، داڑھی رکھو، حج کو جاؤ، تاکہ زمانہء حال میں اسلام قائم رہنے کی دلیل دنیا والوں کے سامنے باقی رہ سکے۔ اسلام کی روح تو تقوئی ہے جو موجودہ مسلمانوں کے زندگی میں قائم نہ رہ سکا۔ کم از کم اس کے ڈھانچہ کو ہی بچانے کی کوشش کو جاری رکھا جائے۔

بڑی افسوس کی بات ہے کہ موجودہ مسلمان حدیث، قرآن اور شریعت کی بات کرتا ہے اور ایک دوسرے سے خود کو افضل مسلمان سمجھتا ہے، صوفیائے کرام کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے، جب کہ اسے خود پتہ نہیں کہ وہ اسلام کے دائرہ سے باہر ہے۔

مسلمان ہونے کا مطلب روزہ، نماز، زکوۃ، حج ادا کرنا نہیں بلکہ مسلمان ایک ایسے کردار کا نام ہے، جو جھوٹ نہیں بولتا، دھوکا نہیں دیتا، چغلی نہیں کرتا، وفاداری اس کی پہچان ہے جو کہتا ہے وہ کرتا ہے، اپنے قول سے کبھی مکرتا نہیں، ظلم نہیں کرتا اور نا ظلم کو برداشت کرتا ہے، ظلم چاہے اس کے ساتھ ہو یا کوئی دوسرے کے ساتھ کررہا ہو اسے روکتا ہے، اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ ہے ایک مسلمان کی پہچان اور اس کا کردار۔ اسی کردار پر مسلمان پوری دنیا میں ہر قوم پر غالب ہوئے، اس کردار کے بنا پر انھیں ہر جگہ عزت و مرتبہ حاصل ہوا، لیکن اکیسویں صدی کے مسلمان کا کردار و پہچان بالکل اس کے برعکس ہے، اس کا کردار و پہچان روزہ، نماز، حج، زکوۃ اور اس کے ساتھ جھوٹ، فریب، مکاری، ظلم، چغل خوری اور بے ایمانی بن چکا ہے۔ اب یہ کسی بھی طرح سے سماج میں بھروسے کے قابل نہیں رہ گیا ہے۔ اس لیے سماجی طور سے یہ پوری طرح سے ناکام ہو چکا ہے اور ہر مقام پر ناکامی، رسوائی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ ہندوستان میں اسلام مسجد کی میناروں سے،

موذن کی آذانوں سے، درگاہوں کے گنبدوں سے اور صوفیوں کے مزاروں سے زندہ دکھائی دیتا ہے مسلمانوں کے کردار وعمل سے نہیں۔

صوفیاء کرام نے اسلام کے بنیادی تقاضے اور اس کے مقاصد کو سمجھنے کی کوشش کی، کہ اس زمین پر قائم وغالب رہنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح اپنے کردار کو بلند کرنا ہوگا، سچائی، ایمانداری قائم کرنا، غیبت، چغل خوری، ظلم وتشدد اور دھوکا دھڑی جیسے عمل سے خود کو محفوظ رکھنا ہوگا، تبھی ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر ہو سکے گی۔ اور اسی بنیاد پر کسی بھی سماج وقوم میں عزت و برتری حاصل کی جاسکتی ہے، ان کی یہ سمجھ رنگ لائی اور وہ اچھے اخلاق اور کردار سے پوری دنیا میں اسلام کے پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوئے۔ اور ہر جگہ وہ ہر قوم میں انھیں عزت و اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ اور یہ مقام ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہا۔ صوفیاء کرام نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان کبھی مرتا نہیں ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان ہو۔ اس کی عزت وحرمت تا قیامت باقی رہتی ہے۔

جس طرح ایک انسان کی آنکھ، ناک، کان اور دیگر اعضا کو ملا کر جسم انسانی کہا جاتا ہے لیکن ان سب کو چلانے یعنی حرکت دینے والی چیز روح ہے، اگر جسم سے روح نکل جائے تو جسم کا پورا حصہ حرکت کرنا بند کر دیتا ہے اور اس خوبصورت اور صحت مند جسم کا کوئی مول نہیں رہ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسلام میں کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج یہ سبھی ارکان اسلام کے باہری ڈھانچہ ہے اور اس کا روح تقویٰ یعنی تصوّف ہے۔ اگر دین سے یہ نکل جائے تو دین بے جان ہو جائے گا، مذہب چاہے جتنا اچھا ہو اگر اس میں تقویٰ نہیں ہے تو وہ بے جان ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی سے جب تقویٰ نکل گیا تو اسلام مذہب بے جان ہو کر رہ گیا اور ساری برائیاں دنیا والوں کو اسلام کے اندر دکھائی دینے لگیں۔ جب کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات کو قائم کرنے والا فطری مذہب ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کو رہنمائی کرتا رہے گا۔

اکیسویں صدی کا ہندوستانی مسلمان اسلام کو مکمل نظام حیات کی حیثیت سے قبول کرنے اور اسے سمجھنے میں ناکام ہیں اس کی توجہ معاشی زندگی کو مضبوط کرنے اور آرام وآسائش کے سامان کو حاصل کرنے کی کوشش کو اپنا بنیادی مقصد سمجھ لیا اور مذہب اسلام کو صرف کلمہ ونماز پڑھنے تک اپنی زندگی میں قائم رکھا ہے اور اس بات کا پیغام دیتا ہے کہ کلمۂ توحید یعنی ایمان پر جس کا خاتمہ

ہوگا وہ جنت میں ضرور جائے گا، باقی برائیوں اور کوتاہیوں کو اللہ اپنے رحم وکرم سے معاف کر دے گا، اکیسویں صدی کے علما بھی کلمہ توحید اور نماز کو اسلام کی بنیاد مان کر اس کی تعلیم پر زیادہ زور دینے لگے۔ حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق وفرائض کو بھول گئے، کلمہ، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج یہ اسلام کے بنیادی کھمبے ہیں جسے عملی زندگی میں لا کر اپنے اخلاق وکردار کو درست کر کے ایک اچھے معاشرہ کی تعمیر کرنا یہی اسلام کا تقاضہ ہے۔ موجودہ مسلمان اسلام کے اس فلسفہ اور بنیادی حقوق اس کی بنیادی تقاضوں اور اسلام کے مقاصد کی طرف غور وفکر نہیں کرتا اور نا ہی اسلام کی کتابوں کو مطالعہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف کتابوں میں دکھائی دیتا ہے، مسلمانوں کے عملی زندگی میں نہیں۔

صوفیائے کرام اسلام کو کتابوں کے ذریعہ یا حدیث لوگوں کو سنا کر نہیں بلکہ قرآن اور سنت کو عملی طور پر اپنا کر لوگوں میں اسلام کی وضاحت کی، کہ اسلام کیا ہے، اسلام کا نظام حیات کیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کی سنت کو نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا، یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے بعد انھی صوفیاء کرام نے جگہ جگہ خانقاہیں قائم کر کے پورے دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ دہلی میں چار سو خانقاہیں قائم تھیں جہاں اسلام کی تعلیمات کے علاوہ غریبوں، فقیروں اور مسافروں کو حلقۂ تعلیم کے ساتھ دو وقت کا کھانا مل جایا کرتا تھا۔ لوگ خانقاہوں میں جا کر غریبوں وفقیروں کا حق پہنچایا کرتے تھے جس کی وجہ سے ہر دن لنگر چلتا رہتا تھا، کوئی بھی مسلمان سڑکوں وگھروں میں جا کر بھیک نہیں مانگتا تھا۔ کیونکہ اسے دو وقت کی روٹی آسانی سے خانقاہوں میں مل جایا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ تیرہویں صدی سے بیسویں صدی تک ہندوستانی مسلمان صوفیائے کرام کی محفل اور اس کے آستانہ مبارک پر اپنی حاضری سے قلبی سکون پاتے تھے، مراقع دہلی کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی والے ان بزرگوں کے آستانے پر حاضری دینا تبرک اور قلبی سکون کا ذریعہ سمجھتے تھے، لیکن افسوس 1947 میں ملک کے بٹوارے کے بعد دہلی والے دہلی چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور انھیں کے ساتھ دہلی کی روحانیت بھی ختم ہو گئی۔ آج دہلی کی درگاہوں پر بیٹھے مجاوران بزرگوں کی حرمت سے ناواقف ہیں، وہ لوگ صرف روٹی حاصل کرنے کی فکر میں ہیں، ان بزرگوں پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر بزرگوں کی مزاریں ناپید ہوتی جا رہی ہیں اور دہلی کا اسلامی کلچر ناپید ہو کر رہ گیا ہے۔

موجودہ وقت میں دہلی میں ایک بھی خانقاہ نہیں ہے جہاں سے اسلام کی نشرواشاعت کے ساتھ غریبوں دفقیروں اور بے سہارا لوگوں کو دو وقت کی روٹی مل سکے۔ یہ کام اب گرودوارہ میں ہو رہا ہے، وہاں لنگر چلتا ہے جہاں غریبوں و بے سہارا کو دو وقت کی روٹی مل جایا کرتی ہے۔ موجودہ وقت میں خانقاہی نظام نہ ہونے کی وجہ سے غریب و بے سہارا مسلمان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جگہ جگہ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ انھیں باتوں کے مدنظر میں نے دہلی کی درگاہیں، مقاماتِ اولیا، دہلی ، دہلی کے بتیس خواجہ کی چوکھٹ، مزارات اولیا اور تصوف اور خاتین اولیا، دہلی، تصوف اور شیخ ابوبکر طوسی حیدری قلندر عرف مٹکا پیر، تصوف اور صوفیوں کا کردار عمل اور مسلمانوں میں اختلاف کے اسباب، جیسی کتابوں کو اپنی تحقیق کے ذریعہ لکھا اور اس تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے دہلی کے شاہین باغ، جامعہ نگر میں ایک صوفی مطالعاتی فاؤنڈیشن کا قائم کیا تاکہ ہندوستان کے تمام علاقوں کے صوفیاء کرام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاسکے اور صوفیائے کرام کی اخلاقی تعلیمات کو عام لوگوں تک پہنچایا جاسکے۔

اس طرح اسلامی نظریہ، تمدن اور ایک اچھے معاشرے کی تعمیر کرنے کے نظریے پر غور کرتے ہیں تو ہندوستان کے تمام مسلمان اسلام کی معاشرتی زندگی قائم کرنے میں پوری طرح سے ناکام ہیں۔ لیکن اس کے ڈھانچہ کو بچانے کے لیے سبھی فکرمند ہیں۔ اور اپنے اپنے طرح سے کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے:

☆ اہل حدیث فرقہ حکومت سعودی عرب کی مدد سے قرآن چھپوا کر تقسیم کر کے اور لوگوں کو اس پر قائم رہنے کا پیغام دے کر اسلام کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن تقویٰ اور پرہیزگاری جیسے عمل کو اپنی زندگی سے دور رکھنا چاہتا ہے، تقویٰ اسلام کی روح ہے جس کو صوفیاء کرام نے اپنے عملی زندگی میں زیادہ اہمیت دی، اس لیے صوفیاء کرام کے عمل سے خود کو دور رکھنا چاہتا ہے۔

☆ جماعت اسلامی ہند اسلامی تعلیمات اور اس کے افکار و نظریات کو کتابوں کے ذریعہ پھیلا کر اسلام کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اسے عملی طور پر کیسے زندگی میں قائم کیا جائے اس پر غور و فکر نہیں کرتا۔

☆ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ماننے والے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اُن کی سنتوں کو مکمل طور پر عملی زندگی میں نہیں داخل کرتے

☆ تبلیغی جماعت والے گشت کرنا، جماعت میں جانا و نماز سکھانے جیسے عمل کو اسلام سمجھتے ہیں۔لیکن اپنے اخلاق و برتاؤ میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتے۔

☆ کچھ لوگ صوفیاء کرام کی عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کو اسلام سمجھتے ہیں۔لیکن ان کے عملی زندگی کو اپنے زندگی میں لانے کی کوشش نہیں کرتے۔

☆ دیوبند اور ندوہ جیسے ادارے حافظ و عالم پیدا کرنے اور مختلف پہلوؤں پر فتوی جاری کرنے کے عمل کو اسلام سمجھتے ہیں۔لیکن اسلام کے روحانی پہلو کی تعلیمات سے اپنے طلباء کو آشنا نہیں کراتے۔

☆ شیعہ حضرات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کو اسلام سمجھتے ہیں۔لیکن امت محمدی سے قومیت کا رشتہ اپنی عملی زندگی میں قائم کرنے کا خیال نہیں رکھتے۔

☆ جمعیۃ علمائے ہند سیاست میں حصہ داری بنانے و مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی کوشش کو اسلام سمجھتی ہے۔لیکن قوم کی سیاست میں بھاگیداری بنانے میں پوری طرح ناکام ہے۔

☆ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے وہ اسلام کی انسانیت، انصاف پرستی و حقوق العباد جیسے بنیاد کو اپنے زندگی میں قائم رکھ کر روزہ، نماز اور حج جیسے عمل سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے۔جس کی وجہ سے مسلم سماج سے ان کا تعلق نہیں بن سکا اور وہ قوم و مسلم سماج کی اصلاح کرنے میں ناکام ثابت ہوئے۔

اس طرح لوگ الگ الگ طریقہ سے اسلام کی اشاعت کی کوششیں کر رہے ہیں۔ یہ سبھی لوگ دینِ محمدی کی ہی پیروی کرنے والے ہیں، تو پھر آپسی اختلاف کیوں رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو کافر و مشرک کیوں سمجھتے ہیں۔آپسی نفاق کیوں پیدا کرتے ہیں،۔حقیقت تو یہ ہے کہ ہم سبھی اسلام کی معاشرتی و سماجی زندگی کو جس کی بنیاد اچھے اخلاق اور بلند کردار کی تعمیر کرنا ہے، کو اپنے پیروں سے پامال کر رہے ہیں اور انفرادی فرقہ بنا کر ذاتی طور سے اپنے طریقے سے دین کی اشاعت کرنا ہی اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں جو دین محمدی نہیں ہے،یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان آپسی نفاق کے شکار ہو گئے ہیں، پیسہ ان کا ایمان بن چکا ہے کیوں کہ یہ پیسے سے سب کچھ ہوتے دیکھ رہے ہیں، ایمانداری و اچھے اخلاق و کردار کو عملی زندگی میں لا کر دو وقت کی روٹی بھی نہیں مل سکتی ہے، موجودہ نئی نسل کی یہ سمجھ بن چکی ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ نسل میں تہذیب، تمدن اور

ادب وسلیقہ نام کی چیز دکھائی نہیں دے رہی ہے جب کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کی فتح ان کے اچھے اخلاق وکردار کی بنا پر ہوئی، یہی ان کا سرمایہ ہے، جسے نئی نسل کھوتی جارہی ہے۔

اردو زبان کا ادب ومعاشرہ کو سکھانے میں اہم رول رہا ہے،لیکن موجودہ مسلمان اپنے بچے کو انگریزی زبان پڑھانا چاہتا ہے اردو نہیں، کیوں کہ وہ اس طرح کی تعلیم اپنے بچے کو دینا چاہتا ہے جس سے وہ زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکے۔اسے جلد نوکری مل سکے۔اسے زندگی گزارنے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ادب، معاشرہ اور مذہب کی نہیں، اس کا پورا ایمان اور عملی زندگی کا نظریہ (Food is God) روٹی ہی خدا ہے، یعنی زندگی کا مقصد پیسہ ہے، مذہب نہیں پر مبنی ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام میں رشتہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے،کوئی کسی کا نہیں ہے، باپ بیٹی اور باپ بیٹے، ماں اور بیٹے، بیوی اور شوہر کے رشتے، سبھی کے سبھی مطلب پرستی کے رشتہ پر چل رہے ہیں، مسلمان اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو اس لیے اعلیٰ تعلیم دے رہے ہیں کہ اسے نوکری جلد مل جائے گی۔ بیٹا نوکری پاکر شادی ہوتے ہی والدین سے الگ ہو جاتا ہے اور بیٹیاں کما کر گھر چلاتی ہیں، جس کی وجہ سے ان کے والدین اس کی شادی نہیں کرتے، اس کی زندگی کیسے گزرے گی نہیں سوچتے بلکہ پوری عمر گھر بیٹھا کر اس کی کمائی کھاتے ہیں اور اس کے ارمانوں کا گلہ گھونٹ دیتے ہیں اور بعض مسلمان دنیا والوں کو دکھانے کیلئے اور اپنی بیٹی کی باغیانہ عمل سے بچنے کیلئے اس کی شادی تو کر دیتے ہیں لیکن کوئی بہانا بنا کر جلد ہی طلاق بھی لڑکے سے لے لیتے ہیں اس دوران ایک اولاد بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کے ساتھ لڑکی اپنا دل لگا کر زندگی بسر کرتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کی ایک عورت چار ماہ سے زیادہ اپنے شوہر سے الگ رہ کر اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتی ہے،لیکن اب مسلمان کی بیٹیوں کو شوہر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب اس کی ضرورت آسانی سے گھر ہی میں پوری ہو جاتی ہے۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا بھی زمانہ آئے گا جو اپنے ہی اولاد کی زندگی کو برباد کر کے مسلمان عیش وعشرت کی زندگی گزارے گا۔ویسے اس طرح کی مثال دیگر قوموں میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔اس طرح کے سوچ رکھنے والے مسلمان اسلام کے پردہ ولڑکیوں کے بالغ ہوتے ہی شادی کر دینے کے حکم کو اور دیگر سماجی نظام کو برا سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے ملک میں ہی ان کا کوئی وقار ومقام نہیں ہے۔ایک معمولی بی جے پی کا فرد انھیں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور

ان کے پاس اس کا جواب نہیں ہوتا ہے، کیونکہ ان کا اپنا کوئی تعلیمی وفکری نظریہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہیں بھی کسی بھی مقام پر اسٹینڈ نہیں کر پاتے۔

اس طرح جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ اندازہ لگتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے نبی کے فرمانوں کو اپنے قدموں سے کچل کر اسے نا قابل عمل ثابت کر دیا ہے پھر بھی بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ ہم کافروں سے افضل ہیں جنت میں ہم ہی جائیں گے، کلمہ ہمیں جنت میں لے جائے گا، کلمہ پڑھ کر ہم جنت کا حقدار بن جائیں گے، علماء بھی یہی کہتے ہیں کہ مسلمان چاہے جتنی برائی کرے وہ جنت میں ضرور جائے گا، علماء کی اس سمجھ اور پیغام سے مسلمان حق اور ناحق، نیکی اور بدی، بھلائی اور برائی میں فرق کی تمیز کو کھو بیٹھے اور اشرف المخلوقات ہونے کے تقاضہ کو بھی بھول گئے۔ شیخ علی ہجویری لکھتے ہیں کہ علماء جاہل ہیں وہ شریعت کو جانتے ہیں پہنچانتے نہیں، علماء جانتے ہیں کہ کلمہ پڑھنے والا جہنم میں نہیں جائے گا لیکن وہ کلمہ کے تقاضے کو نہیں پہنچانتے کہ کلمہ پڑھنے والے کا سب کچھ بدل جاتا ہے، وہ وہ نہیں رہتا جو کلمہ پڑھنے سے پہلے تھا۔

موجودہ وقت میں مسلمانوں کی نظر میں کسی بھی انسان کی قدر و قیمت اسکے تقویٰ و پرہیز گاری اور اس کے جذبۂ قربانی، اس کے کارنامے کے بنا پر نہیں ہے بلکہ اسکی آمدنی اور معاشی حالت کے بنا پر ہے، شیعہ، سنّی، دیوبندی، بریلوی، قادیانی، اہل حدیث، اہل قرآن جیسے فرقے کا تعصب اور سید، شیخ، پٹھان، انصاری برادری کی تعصب کے علاوہ زبان اور علاقائیت کا تعصب اس حد تک ہے کہ اس تعصب کے چشمہ (نظریہ) نے کسی شخص کی نیکی قربانی اور کارنامے کو نظرانداز کر رکھا ہے جس سے مسلمان آپسی نفاق کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے اندر سے اتحاد و باہمی تعلقات جیسی خصلتیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح کی سوچ اور نظریہ اسلام کو قطعی پسند نہیں ہے، کسی بھی انسان کو اسکے فرقے، ذات پات اور علاقائیت کے بنا پر دیکھا جائے اور اس بنا پر اسکو عزت و قدر دی جائے تو اس طرح کی سوچ رکھنا سراسر غیر انسانی و غیر اسلامی ہے۔ اور اس طرح کی بیماری کا شکار سب سے زیادہ اتر پردیش کے مسلمان ہیں۔ ہندوستان میں تعصب پرستی کے فتنے کا مرکز اتر پردیش ہے جہاں پر دنیا کے تمام فتنے پروان چڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ جس کے شکار تمام ہندوستانی مسلمان ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی قائد نہیں ہے اور یہ کسی کو اپنا قائد ماننے کیلئے تیار بھی نہیں ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

ہر مسلمان اپنے آپ کو قائد سمجھتا ہے اسے کسی قائد کی ضرورت نہیں ہے، وہ انفرادیت میں اپنی کامیابی دیکھتا ہے اجتماعیت میں نہیں، اوراس طرح کے نظریہ کی بنیاد تعصب پرستی ہے۔

کال مارکس کے نظریہ ہنر، مشین اور معاشی ترقی نے پوری دنیا کو بدل ڈالا، اس کا اثر سب سے پہلے یوروپ پر پڑا، اس نے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک نیا مذہب بنایا جس کا وجود من چاہی زندگی پر مبنی ہے، دنیا میں خوب موج و مستی کرو، زندگی ایک بار ملی ہے دوبارہ نہیں ملے گی، مذہبی پابندیوں کے ساتھ موج مستی سے بھری خوشحال زندگی نہیں گذاری جاسکتی اسی نظریہ کے تحت پورے یوروپ والوں نے اپنا ایک الگ سماجی نظام بنایا جس پر عمل پیرا ہو کر دنیا والوں کے سامنے خود کو ایک کامیاب اور ترقی پسند ملک ہونے کا دعویٰ پیش کیا۔ اوراب یہی سوچ مسلمانوں کی بھی بنتی جارہی ہے وہ بھی اسلام کی پابندیوں سے بھری زندگی کو چھوڑ کر یوروپ والوں کی طرح من چاہی اور خوش حال زندگی بسر کرنے کی فکر میں لگے ہیں اوراس کیلئے کوشش بھی کر رہے ہیں۔ جس طرح عیسائی اپنی بائبل کو چھوڑ کر اپنے آپ کو کرسچن کہتے ہیں اسی طرح قرآن کو چھوڑ کر مسلمانوں نے بھی اپنے آپ کو مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو دیکھتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر موجودہ مسلمانوں کا صحابہ کرام اور صوفیاء کرام کے اخلاق و کردار اور اسلام کے لیے جذبۂ قربانی سے موازنہ کیا جائے تو تمام صحابہ کرام و صوفیاء کرام پاگل اور مجنوں دکھائی دیتے ہیں، اوران کی زندگی کو دیکھتے ہوئے اگر موجودہ مسلمانوں کو دیکھا جائے تو یہ کہیں سے بھی قطعی طور پر مسلمان نہیں دیکھائی دیتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے معاشی حالات کا جائزہ لینے کے مقصد سے کانگریس حکومت نے ۲۰۰۵ء میں ایک سروے کروایا جو سچر کمیٹی کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کمیٹی نے اپنے سروے رپورٹ میں کہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشی حالت ہریجن طبقہ کے برابر پہونچ چکی ہے۔ لیکن جب میں نے ہندوستان کا دورہ کیا تو خاص کر بہار، بنگال، اتر پردیش، دہلی اور ہریانہ کے مسلمانوں کو پایا کہ یہاں کے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور اخلاق و کردار ہریجن طبقہ سے بھی نیچے گر چکا ہے ان کا لباس اور رہن سہن بھلے ہی ہریجنوں سے صاف ستھرہ اوراعلی دکھائی دیتا ہو لیکن انکی روح کنگال ہو چکی ہے اور پیسہ ان کا مزاج اور ایمان بن چکا ہے۔

موجودہ وقت میں منافق اور مسلمان میں فرق کو سمجھنا مشکل ہو چکا ہے موجودہ مسلمان اخلاق اور بات سے تو مسلمان دکھائی دیتا ہے لیکن جب کردار و عمل کی بات آتی ہے تو وہ بدل

جاتا ہے، اس طرح کا عمل کرنا منافقت کی پہچان ہے، منافق کافروں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں کیوں کہ وہ دھوکے باز و مکار ہوتے ہیں ان کی پہچان مشکل ہے، منافق سے تو اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے۔

جب میں نے بہار، بنگال اور اترپردیش کی خانقاہوں کا دورہ کیا تو پایا کہ یہاں ایک نام نہاد خانقاہ قائم ہے ان میں علمی مجلسیں یا لنگر کا کوئی اہتمام نہیں ہے، اور ان خانقاہوں سے اب مسلمانوں کا کوئی تعلق یا دلچسپی نہیں ہے، اگر ہے تو صرف دعا و تعویذ کے لئے ہے، یہاں کے گدّی نشیں اپنی معاشی زندگی کے لئے نوکری کرتے ہیں یا تعویذ لکھ کر اپنا گذارا چلاتے ہیں، اب لوگوں کی رہنمائی و دینی تربیت کا کام یہاں نہیں چل رہا ہے، مسلمانوں کا دین سے بے رغبتی کا عالم یہ ہے کہ یہ مقام جہاں لوگ اکٹھا ہو کر دینی و روحانی تعلیم حاصل کرنے کیلئے یہاں آتے تھے اور وہاں کے خرچ کے لئے غلّہ یا رقم بھیجا کرتے تھے لیکن اب یہاں خاموشی اور مایوسی کی سی حالت بن چکی ہے۔ اب خانقاہوں کی جگہ درگاہوں نے لے لی ہے یہاں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے لوگ اپنی حاجت پوری کرنے کیلئے یہاں حاضر ہوتے ہیں اور موجودہ مسلمانوں کی حاجت اب علمی شعور، تہذیب وتمدن اور آخرت نہیں ہے بلکہ دنیاوی حاجت بن چکی ہے جسے حاصل کرنے کیلئے وہ درگاہوں پر دعا کیلئے حاضر ہوتے ہیں۔ دعا قبول ہونے کیلئے یہاں کے سجادہ کو پیسہ دیتے ہیں تاکہ ان کی دعا سے ان کی مرادیں پوری ہو جائیں۔ یہاں کے سجادہ کی آمدنی بھی اچھی ہے، وہ خوشحال بھی دکھائی دیتے ہیں، لیکن یہاں کی آمدنی سے اسلام کی نشر و اشاعت یا غریبوں و مسکینوں کا کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے بلکہ یہاں کے خادم کی روزی روٹی ان غریبوں سے ہی چل رہی ہے، کیونکہ درگاہوں پر زیادہ تر غریب اور مجبور مسلمان ہی حاضر ہوتے ہیں۔

یہ ایک تنقیدی مطالعہ نہیں ہے بلکہ موجودہ صورت حال کا جائزہ ہے، جو ایک سچائی ہے جسے دیکھنے سمجھنے کی ضرورت ہے اور غور و فکر کر کے مسلمانوں کی سماجی و مذہبی زندگی اور ان کی ذاتی زندگی کو اصلاحی تنظیم اور نظام قائم کر کے اسے سدھارنے کی ضرورت ہے، اور اب اسے سدھارنے کے لئے عرب یا بغداد سے کوئی مسلمان نہیں آئے گا بلکہ ہندوستان کے اہل علم مسلمانوں خاص کر علماء طبقہ کو اس کام کو انجام دینے کے لئے اپنا وقت دینا چاہیے اور اس پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ آئیں ہم سب مل کر ایک اچھے معاشرے کی تعمیر کریں۔

☆☆☆

تیراہواں باب

جدید دنیا کے مسائل کو حل کرنے میں تصوف کی اہمیت اور ضرورت

صوفیہ کی جماعت، بیدار افراد کی جماعت ہے۔ یہ ان لوگوں کی جماعت ہے، جنھوں نے اپنے خالق و مالک کو پہچاننے کی کوشش کی اور تمام انسانوں کو اس کے عرفان کی طرف بلایا۔ انھوں نے زندگی اور زندگی کے مقصد کو پہچانا اور دوسروں کو بھی اسکی دعوت دی۔ ہم سورہے ہیں، کیونکہ ہم مقصد زندگی سے غافل ہیں، لیکن صوفیہ کی تعلیمات میں آج بھی وہ طاقت ہے، جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونک سکتی ہے۔ خوابیدہ انسانیت کو جگا سکتی ہے۔ سونے والے غافل انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرسکتی ہے۔ ہمارے دور میں مسائل کی بھرمار ہے، مگر تصوف میں تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ آج جن مسئلوں سے دنیا دوچار ہے، ان میں سب سے اہم ہیں، سماجی تشدد، باہمی منافرت، دہشت گردی، عدم مساوات، دولت اور انسانی وسائل کی نامنصفانہ تقسیم، اخلاقی خرابیاں اور ان کے دم سے پیدا ہونے والے مسائل۔ تصوف کی یہ خوبی ہے کہ یہ ہر عہد کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ یہ افراد اور جماعت دونوں کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر دور جانے کی ضرورت نہیں، آپ کشمیر کو دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تغلق عہد تک ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ اسکی پسماندگی صرف معاشیات تک محدود نہیں تھی، بلکہ یہ مذہبی، سماجی، علمی اور فکری اعتبار سے بھی ایک پسماندہ خطہ تھا۔ شرک و بت پرستی عام تھی، جس کے سبب خدا کے سوا سب کا خوف انسان کے دل میں موجود تھا۔ دریا کی

روانی، موجوں کی طغیانی، پہاڑوں کی بلندی، پتھروں کی سختی، درختوں کی ہریالی، پودوں کی شادابی سب اس کے جبینِ شوق کے مسجود تھے۔ اگر کوئی ذات ان کے جذبہ عبودیت سے دور تھی تو وہ وحدہٗ لاشریک کی ذات تھی۔ آدمی، آدمی کے ظلم سے پریشان تھا اور آواز اٹھانے کی ہمت سے بھی محروم تھا۔ یہاں ستی جیسی ظالمانہ رسم عام تھی۔ صنعت وحرفت جو، اب اس وادی کی پہچان بن چکے ہیں، انکا نام ونشان تک نہ تھا۔ ایسے میں ایک خدا رسیدہ صوفی حضرت شرف الدین بلال شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے قدم اس سرزمین پر پڑے۔ وادی کی فضا نعرہ توحید سے گونج اٹھی۔ چراغ معرفت سے دلوں کے چراغ جل اٹھے اور رشد وہدایت کی قندیلوں نے جہالت وجاہلیت کے اندھیروں کو دور کردیا۔ حضرت شاہ ہمدان سید علی ہمدانی نے سات سو بیدار انسانوں کے قافلے کے ساتھ وادی میں قدم رکھا۔ اچانک ماحول بدلنے لگا۔ خوابیدہ انسانیت انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگی۔ جو خود جاگ اٹھے انھوں نے دوسروں کو بھی جگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا سماج جاگ اٹھا۔ معاشرہ بیدار ہوگیا۔ انسانوں کو اب اپنے مسائل نظر آنے لگے اور ان کے حل بھی سمجھ میں آنے لگے، کیونکہ تصوف دنیا کے ہر مسئلے کا حل پیش کرتا ہے۔

دے رہا ہے عہدِ رفتہ آج بھی اپنا نشاں
آج بھی خاکسترِ ماضی سے اٹھتا ہے دھواں

تصوف کو آج ایک قصہ پارینہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ماضی کی داستان سمجھا جاتا ہے۔ اسے بس کتابوں کی بات سمجھا جاتا ہے، جو عملی طور پر ممکن نہیں۔ پریکٹیکل میں اسے برتا نہیں جا سکتا۔ حالانکہ یہ خیال سراسر غلط ہے اور ہماری لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ تصوف کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ ضرورت اسے سمجھنے کی ہے۔ ضرورت اسے کتابوں سے باہر نکالنے کی ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال تک تصوف عالم اسلام کے نصابِ تعلیم کا حصہ رہا ہے۔ تب انسانی اخلاقیات پر اس کا زبردست اثر بھی مرتب ہوتا تھا مگر رفتہ رفتہ اسے نہ صرف نصابِ تعلیم سے الگ کیا گیا بلکہ اس کے اثرات کو ذہنوں سے بھی کھرچ کر مٹا دینے کی کوشش شروع ہوئی۔ اسکولوں کو تو چھوڑیے، مدرسوں نے بھی اسے اپنے نصاب میں شامل کرنے سے انکار کردیا۔ جو علم ایک ہزار سال تک اسلام کی روشنی پھیلاتا رہا، کفروشرک کے اندھیرے دور کرتا رہا، لاکھوں، کروڑوں ظلمت کے شکار دلوں کو توحید کے نور سے منور کرتا رہا وہی اچانک شرک قرار پایا۔ یہ صوفیہ ہی تھے، جن کے دم قدم سے

برصغیر میں اسلام کا آفاقی پیغام پھیلا، مگر انھیں شرک و بدعت کا مبلغ قرار دیا گیا۔ جن لوگوں نے صوفیہ کے دست حق پرست پہ اسلام قبول کیا تھا، انھیں کی اولاد نے اپنے محسنوں کو بدعت گر قرار دیا۔ یہ ستم اگر یہیں تک محدود رہتا تو بھی ایک بات تھی، تصوف پر ایک بڑا ظلم خود تصوف کے نام پر ہوا۔ صوفیہ کے نام لیواؤں نے کیا، جنھوں نے اسے روزگار کا ذریعہ بنایا اور اسے بدنام کرنے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی۔ مزارات اولیاء، جو لاکھوں خوش عقیدہ دلوں کے مرکز تھے، انھیں مادہ پرست عناصر نے اپنی کالی کمائی کا ذریعہ بنایا۔ آج مزارات اولیاء کے ایسے خدام بھی ہیں جن پر چوری، چھنتائی، غنڈہ گردی، قتل اور عصمت دری کے مقدمات چل رہے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ دنیا دار پیر بھی تصوف کی تجارت میں پیش پیش ہیں، جو تصوف کی 'ت' سے بھی واقف نہیں مگر پیری مریدی کی دکانیں چلا کر بھولے بھالے عوام کو ٹھگ رہے ہیں۔ خانقاہیں جہاں دِلوں کو پاکیزگی بخشی جاتی تھی اور بڑے بڑے دنیا دار بھی آ کر مادہ پرستی کی کثافت سے پاک ہو جاتے تھے، اب صرف مالی منفعت کے لئے قائم ہو رہی ہیں اور اسی لئے سجادہ نشینی کی جنگوں کی آماجگاہ بھی ہیں، ان کی حیثیت اب شورموں (SHOW ROOMS) سے زیادہ نہیں رہی۔

مرید سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے پیر کو بھی یہ توفیق

تصوف جو ایک خالص روحانی تحریک تھی اسے ایک صنعت کا روپ دے دیا گیا۔ مغرب جو ہر جگہ دولت کمانے کے راستے تلاش کرتا ہے، اس نے اس سے اکتسابِ زر کے مختلف طریقے ڈھونڈ لئے ہیں۔ کہیں صوفیانہ گانے گائے جا رہے ہیں تو کہیں صوفیانہ ڈانس ہو رہے ہیں۔ کہیں فیشن شوز ہو رہے ہیں تو کہیں کسی اور طریقے سے تصوف کے نام کو بدنام کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ان سوقیانہ افعال کا صوفیانہ اعمال سے کیا تعلق؟ آج تصوف کی اصل تعلیمات، خرافات میں گم ہوتی جا رہی ہیں لہٰذا اس کی شدید ضرورت ہے کہ لوگوں کو حقیقی تصوف سے آگاہ کیا جائے اور اس کی معنویت کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ آج کے مشینی دور میں انسان ایک بار پھر تصوف اور روحانیت کی طرف دھیرے دھیرے لوٹ رہا ہے۔ آج کی دنیا انسان کو سب کچھ دے سکتی ہے مگر ذہنی اور قلبی سکون

نہیں دے سکتی۔ قلبی سکون تو اسے تصوف ہی دے سکتا ہے۔ خصوصی طور پر میں نے تصوف میں غیر مسلم بھائیوں کی گہری دلچسپی محسوس کی ہے۔ وہ خواجہ معین الدین چشتی، قطب الدین بختیار کاکی، نظام الدین اولیاء، نصیر الدین چراغ دہلی، بندہ نواز گیسودراز، مخدوم شرف الدین یحیٰ منیری، مخدوم اشرف جہانگیر اور دیگر بزرگوں کے آستانوں پر آتے ہیں مگر انھیں کبھی ان کے پیغامات کی جانکاری نہیں مل پاتی۔ حالانکہ وہ ان صوفیہ کی تعلیمات سے آگاہی چاہتے ہیں۔ انکے اندر ایک بے قراری موجود ہے، مگر اسے قرار دینے والے نہیں۔ تصوف میں وہ طاقت ہے کہ اگر اسے صحیح صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا جائے تو کوئی بھی اس کے اثر سے بچ نہ پائے۔

اسلامی تاریخ کے ایک ہزار سال سے زیادہ تصوف کے ہیں۔ اِس دور میں اسے خوب پذیرائی حاصل ہوئی اور تصوف کو ساری دنیا میں پھیلنے کا موقع ملا۔ اس دوران یہ پورے عالم اسلام کے نصابِ تعلیم کا سب سے اہم حصہ رہا۔ پورے عالمِ اسلام میں اس کی درس وتدریس ہوتی رہی، کتابیں لکھی جاتی رہیں، تحقیق وتدوین کا کام ہوتا رہا اور تحریر وتقریر نیز تبلیغ کے ذریعے اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ اس کی اشاعت کا سب سے بڑا کارنامہ خود صوفیہ کرام نے اپنے کردار وعمل سے انجام دیا۔ تصوف میں جو جذب وکشش ہے، اس نے ایک عالم کو گرویدہ کیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ تقریباً دو صدی قبل پہلی بار تصوف کی مخالفت خود مسلمانوں کے ایک حلقے میں شروع ہوئی جو آج تک جاری ہے۔ اس تحریک نے عوام وخواص میں تصوف کے تعلق سے کئی غلط فہمیاں پیدا کیں تو دوسری طرف خود تصوف کے نام لیواؤں کے کردار وعمل نے بھی کچھ غلط پیغام لوگوں میں عام کئے۔ تصوف کو جتنا نقصان اس کے مخالفین نے پہنچایا اس سے زیادہ اس کے نادان دوستوں نے پہنچایا۔

آج کے سماج کو تصوف کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ آج کی دنیا بہت سے مسائل سے دوچار ہے، اور اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہم اپنے مرکز کی طرف پیٹھ کئے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی پرچھائیوں سے الجھ رہے ہیں۔ ہماری نگاہوں سے حقانیت کے اجالے پوشیدہ ہیں۔ ان تمام مسائل کا حل صرف ایک ہے کہ ہم اپنے مرکز کی طرف پیٹھ کے بجائے چہرہ کرلیں، جیسا کہ حضرات صوفیہ کرام نے کیا۔ حق وباطل اس دنیا کی سچائی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حق کو پانے کے لئے اس کی طرف رخ ہونا ضروری ہے۔ اگر انسان کو

اندھیرے کی عادت پڑ جائے تو اسے اندھیرے میں ہی رہنا اچھا لگتا ہے۔ وہ اجالے سے بھاگنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر سویت یونین میں تقریباً ستر سال تک لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ اس دنیا کا کوئی بنانے والا نہیں، یہ خود بہ خود وجود میں آ گئی ہے۔ اس کے نظام کو چلانے والا بھی کوئی نہیں، خود بہ خود یہاں سب کچھ ہو رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے اپنے آپ ہی اپنے محور میں رواں دواں ہیں۔ خدا اور سول، جنت و دوزخ، عذاب و ثواب، روح و آتما کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب انسانی وہم ہے، اندھ وشواس ہے۔ مذہب تو افیم کی گولی ہے جو انسان کے ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ ستر سال میں کروڑوں لوگ اس بات سے متفق ہو گئے۔ انھوں نے مان لیا کہ اس نظام کائنات کو چلانے والا کوئی نہیں۔ سچ پوچھو تو یہ اُن لوگوں کی جماعت تھی جو اجالے سے کوسوں دور ہو گئے تھے۔ جو اندھیرے کے عادی ہو گئے تھے۔ جن کی نگاہیں حقانیت کے اجالوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔ ستر سال تک انھیں اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ یہ وہ سرزمین تھی جہاں سے کبھی روحانیت کا سورج طلوع ہوا تھا۔ جس کی مٹی سے بڑے بڑے صوفیاء، اولیاء، علماء، مفسرین اور محدثین کا خمیر اٹھا تھا۔ اس سرزمین کو کسی دور میں مرکزِ علوم ربانی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اگر انسان کے رخ کو مرکز کی طرف سے پھیر دیا جائے تو یہی ہوتا ہے کہ وہ سچائی سے دور ہو جاتا ہے۔

ہم بھی ایک اندھیرے میں مبتلا ہیں۔ گو یہ اندھیرا سویت یونین کے کمیونسٹ اندھیرے جیسا نہیں مگر ہے بہرحال اندھیرا۔ ہم اندر کے اندھیرے میں گرفتار ہیں، جو ایک روپے کی موم بتی سے دور نہیں ہوتا۔ مذہب پر ایمانداری سے عمل انسان کو دنیا و آخرت کی بے پناہ مسرتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ اس دنیا میں سب سے خوش وہی تھے جنھوں نے سچے مذہب کو اپنایا۔ یہ مذہب خدا کی معرفت کا تھا۔ جنھوں نے اپنایا ان پر مسرتوں کی بارش ہوئی۔ وہ ہر طرح کے مسائل سے بے نیاز ہو گئے۔ دنیا کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ گو آج ہمیں ایسے لوگ نظر نہیں آتے مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی یہ کائنات اس کے نیک بندوں سے خالی ہے۔ ویسے صوفیہ کی کتابیں، ان کے ملفوظات و مکتوبات اور ان کے نشاناتِ قدم آج بھی انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ آج دنیا کے سامنے بے شمار مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں۔ ڈھونڈا جائے تو ان مسائل کا حل اہل تصوف کے نظریات کی روشنی میں مل جائے گا۔

اگر ہم اپنے مسائل کا حل چاہتے ہیں تو ہمیں سچا مذہبی بننا ہوگا، زبانی نہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم مذہبی ہیں، محض ایک دعویٰ ہے۔ ہم ایک خالق و مالک میں یقین رکھنے کی بات کرتے ہیں، ہم اسے پالنہار اور اَن داتا مانتے ہیں مگر ہمارا پورا عمل اِس کے برخلاف ہے۔ ذرا سوچیے کیا ہم واقعی مذہبی ہیں؟ اس وقت ہم سے زیادہ بداخلاق، ہم سے زیادہ بے رحم، ہم سے زیادہ ناخداترس کون ہے؟ ہم نے مذہب کا چولہ پہن لیا ہے، ہم نے اپنے لباس کو مذہبی بنالیا ہے، مگر ہمارا دل مذہب سے خالی ہے۔ ہم نے مساجد، مدرسے اور خانقاہوں کو بھی اپنی لامذہبی سرگرمیوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ مذہب کا تعلق تو دل سے ہے مگر ہمارا دل مذہب سے خالی ہے۔ اگر دل میں مذہب ہوتا تو یہ خدا کا مسکن ہو جاتا، اور رشک عرش ہو جاتا۔ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کے ملفوظات میں ہے کہ رسولِ محترم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ایمان والے کا دل، اللہ کا عرش ہے"۔ (راحت القلوب، ملفوظاتِ فریدالدین گنج شکر، مجلس ۵)

خانۂ دل میں کسی دن آپ کا آنا ہوا
یہ ہوئی عظمت کہ بامِ عرش تہہ خانہ ہوا

جو دل اپنے خالق و مالک کا مسکن بن جائے، اس میں کبھی لامذہبیت نہیں سماسکتی۔ وہاں نفرت اور کدورت کو جگہ نہیں مل سکتی۔ بغض وحسد اور کینہ وتکبر کا وہاں گزر نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنے اعمال اور چرتر کے اعتبار سے مذہبی نہیں ہیں، ہم نے تو صرف مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس پرستم ظریفی یہ کہ جو جتنا بڑا مذہبی نظر آتا ہے، وہ اتنا ہی بڑا لامذہب ہوتا ہے۔ یہ کیسی بات ہے کہ آج دنیا میں جہاں بڑی بڑی انڈسٹریز چل رہی ہیں وہیں ایک انڈسٹری مذہب کی بھی ہے۔ جو دلوں کو جوڑنے کے بجائے توڑنے کا کام کررہی ہے۔

آج دنیا میں نفرت ہی نفرت ہے محبت نہیں

آدمیت، جذبۂ ایثار ہونا چاہئے
آدمی کو آدمی سے پیار ہونا چاہئے

نفرت اور محبت دونوں ہی اس دنیا کا حصہ ہیں انکا وجود ایک حقیقت ہے انھیں ختم نہیں کیا جاسکتا مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ایک کو دوسرے پر غالب کردیا جائے۔ محبت چونکہ اللہ کو پسند ہے اس

لئے اسی کو غالب ہونا چاہئے۔ آج سماج میں نفرت کا غلبہ ہوتا جارہا ہے جو یقیناً باعثِ فکر ہے۔ اللہ نے اس دنیا کو محبت سے پیدا فرمایا، محبت کے لئے پیدا فرمایا پھر یہاں نفرت کا کیا کام؟ مگر افسوس کہ انسان نے اسے کئی قسم کی نفرتوں کا مسکن بنادیا ہے۔ کہیں مذہب کے نام پر نفرت، کہیں زبان کے نام پر تعصب، کہیں رنگ اور نسل کا بھید بھاؤ تو کہیں علاقے کے نام پر جنگ۔

اصل میں ہم اندر کے اندھیرے میں گرفتار ہیں، جو ایک روپے کی موم بتی سے دور نہیں ہوتا۔ مذہب پر ایمانداری سے عمل انسان کو دنیا و آخرت کی بے پناہ مسرتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ اس دنیا میں سب سے خوش وہی تھے جنھوں نے سچے مذہب کو اپنایا۔ یہ مذہب خدا کی معرفت کا تھا۔ جنھوں نے اپنایا ان پر مسرتوں کی بارش ہوئی۔ وہ ہر طرح کے مسائل سے بے نیاز ہو گئے۔ دنیا کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ گو آج ہمیں ایسے لوگ نظر نہیں آتے مگر ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی یہ کائنات اس کے نیک بندوں سے خالی ہے۔ ویسے صوفیہ کی کتابیں، ان کے ملفوظات و مکتوبات اور ان کے نشاناتِ قدم آج بھی انسانیت کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ آج دنیا کے سامنے بے شمار مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں۔ ڈھونڈا جائے تو ان مسائل کا حل اہل تصوف کے نظریات کی روشنی میں مل جائے گا۔

اِس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروّت کو کیا ہوا

کیا ہمارے پیدا کرنے والے نے اسی نفرت اور دشمنی کی لڑائی کے لئے ہمیں اس کائناتِ گیتی (UNIVERSE) میں بھیجا ہے؟ شاید یہی اندیشہ فرشتوں کو بھی تھا اسی لئے انھوں نے اللہ سے جاننا چاہا تھا کہ اے خدا کیا تو ایسے انسان کو زمین میں بسائیگا جو فتنہ وفساد برپا کریگا؟ خون خرابہ کریگا؟ تیری بنائی ہوئی سرزمیں کو نفرت سے بھر دیگا؟ جواب ملا تھا، جو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

آج اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اللہ کی یہ سرزمین نفرتوں سے بھری پڑی ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں جو اس سے خالی ہو۔ امریکہ اور یوروپ میں سیاہ اور سفید فاموں کے اختلافات عام ہیں۔ عیسائی اور غیر عیسائی کے جھگڑے ہر جگہ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ عورتوں کو

عورت ہونے کے سبب ساری دنیا میں دوئم درجے کی شہریت حاصل ہے۔امریکہ خود کو جمہوریت (DEMOCRACY) اور حقوق انسانی (HUMAN RIGHTS) کا سب سے بڑا علم بردار ظاہر کرتا ہے مگر یہاں بھی ایک سیاہ فام کو قصرِ سفید تک پہونچنے میں طویل مدت لگ گئی۔ کوئی عورت تو آج تک ملک کی صدر نہیں بن پائی۔ظاہر ہے اس کے پیچھے وہی صدیوں پرانی سوچ ہے کہ عورت،مرد سے کم تر ہے۔آخر یہ کیسی جمہوریت ہے؟

امریکہ جیسا ہی حال یوروپ کے ممالک کا بھی ہے یہاں کے مسائل بھی لگ بھگ امریکہ جیسے ہی ہیں۔اگر ہندستان کی سطح پر دیکھا جائے تو یہاں صدیوں سے دلتوں کو دبائے رکھا گیا ہے۔حالانکہ سب سے قدیم ہندستانی یہی ہیں اور آبادی (POPULATION) کے اعتبار سے بھی انھیں کی کثرت ہے۔اونچی ذات والے ان آریوں (ARYANS) کی نسل سے ہیں جو بعد میں بھارت آئے اور ملک پر قبضہ کر کے یہاں کے قدیم باشندوں کو غلام بنالیا۔ انھیں شودر اور اچھوت قرار دیکر صدیوں تک ذلیل کاموں پر مجبور کیا۔ بھارت میں جس قسم کے مظالم دلتوں پر ڈھائے گئے اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔اس وقت بھی پورے ملک میں مذہب،ذات برادری اور علاقائیت کے نام پر تعصب کی گرم بازاری ہے۔دہلی،ممبئی اور کلکتہ جیسے میٹرو پولیٹین شہروں میں بہار اور پوربی یوپی والوں کو اکثر لعن طعن اور تشدد کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ایسے ہی حالات کا نتیجہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں کچھ مسلح تحریکیں بھی شروع ہو گئیں ہیں۔ہر طبقے کو یہ شکایت ہے کہ اسے اسکے جائز حقوق نہیں دیے گئے۔کچھ ایسا ہی حال عالمِ اسلام کا بھی ہے۔ پاکستان میں مسلمان ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔مہاجر، سندھی،پنجابی اور بلوچی ایک مذہب کے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔وہ ساتھ رہنا بھی نہیں چاہتے۔وہ موقع ملتے ہی دوسرے طبقے پر حملے کرنے لگتے ہیں۔اس کے علاوہ شیعہ سنی،دیوبندی بریلوی،وہابی اور غیر وہابی اختلافات اپنی جگہ ہیں۔افغانستان میں قبائلی جنگ (TRIBAL WAR) پرانی روایت رہی ہے۔عرب ملکوں میں کئی قسم کے اختلافات رہے ہیں جنھوں نے کبھی کبھی مسلح صورت بھی اختیار کی ہے۔

محبت روشنی ھے

نفرت سے بھری اس دنیا کی ایک ناقابلِ تردید حقیقت محبت ہے۔نفرت اندھیرے کی طرح ہےاور محبت اجالے کی طرح۔ جب محبت کی روشنی پھیلتی ہےتو نفرت کا اندھیرا خود بخود چھٹنے لگتا ہے۔نفرت ہمیشہ وقتی ہوتی ہےاور محبت دائمی۔نفرت کا وجود کمزور بنیادوں پر ہوتا ہےاور محبت کا پختہ بنیادوں پر۔نفرت سوڈا واٹر کی طرح ہوتی ہے جو اچانک ابل پڑتی ہے مگر دیر پا نہیں ہوتی جبکہ محبت مصری کی ڈلی کی طرح ہوتی ہے جو تہہ میں جا کر بیٹھ جاتی ہے اور دھیرے دھیرے گھلتی رہتی ہے۔محبت کی مٹھاس کو دیر تک محسوس کیا جا سکتا ہے مگر نفرت کی کڑواہٹ چند لمحوں کے لئے ہوتی ہے۔دنیا کے کسی بھی واقعے کو آپ مثال بنا کر دیکھ سکتے ہیں۔ہٹلر کا یہودیوں کے خلاف اقدام،امریکہ کا جاپان پر ایٹمی حملہ(ATOMIC ATTACK)مغربی طاقتوں کا عراق اور افغانستان پر حملہ، بھارت میں اعلیٰ طبقات کا پسماندہ طبقات پر ظلم اور مندر مسجد کے نام پر ہونے والی سیاست کے برے اثرات۔بوسنیا اور بھارت کے فسادات میں مسلمانوں کی نسل کشی۔آج یہ تمام باتیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں گو منافرت سرے سے ختم نہیں ہوئی ہے مگر اس میں اب وہ جوش و ابال نہیں رہی جو ابتدائی دنوں میں تھی۔ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ محبت ہمیشہ نفرت پر بھاری پڑتی ہے۔نفرت اور محبت کی جنگ میں جیت سدا محبت کی ہوئی ہے۔

تصوف، محبت کا پیغام ھے

تصوف محبت کا پیغام ہےاور یہ محبت کو کائنات کی روح مانتا ہے۔تصوف کی نظر میں یہ دنیا محبت کی جگہ ہے نہ کہ نفرت کی۔نفرت کی کوکھ سے تخریب جنم لیتی ہے جبکہ محبت تعمیر کی جنم داتا ہے۔ اس دنیا کو محبت کے لئے پیدا کیا گیا ہے،نفرت کے لئے نہیں۔انسان بھی یہاں تعمیر کے لئے آیا ہے تخریب کے لئے نہیں۔حالانکہ انسانی فطرت میں تعمیر (CONSTRUCTION) اور تخریب(DESTRUCTION)دونوں کے عناصر رکھے گئے ہیں،نفرت اور محبت دونوں طرح کے جذبات اس کے دل میں سموئے گئے ہیں مگر تخریب پر تعمیر ہمیشہ حاوی رہی ہے۔نفرت کے عنصر پر محبت کا ہمیشہ غلبہ رہا ہے۔انسان کے اندر کے منفی جذبات محض اس امتحان کے لئے ہیں کہ وہ دنیا میں جا کر ان کا استعمال کس پہلو سے کرتا ہے؟اس کارگاہِ حیات

میں وہ اپنے آپ کو کس طرح محبت کا پاسدار ثابت کرتا ہے؟ یہی انسانی فطرت انسان اور فرشتوں میں فرق کرتی ہے۔معروف صوفی حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے ملفوظات میں ہے کہ رسولِ محترم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ایمان والے کا دل، اللہ کا عرش ہے''۔

(راحت القلوب، ملفوظات فرید الدین گنج شکر، مجلس ۵)

سلسلہ چشتیہ کے مورث اعلیٰ حضرت ممشاد دینوری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''ایمان والے کے دل میں اللہ کی جگہ ہے کہ وہ دل کے سوا باطن میں کہیں نہیں پہنچتا۔''

(نفحات الانس، صفحہ ۲۵۷)

بہ الفاظِ دیگر

خانۂ دل میں کسی دن آپ کا آنا ہوا
یہ ہوئی عظمت کہ بامِ عرش تہ خانہ ہوا

جو مقام عرش الٰہی ہو وہاں نفرت کیسے سما سکتی ہے؟ خدا خالقِ محبت ہے۔اسکا ایک صفاتی نام حبیب ہے۔وہ اہلِ محبت کے دلوں کو پسند فرماتا ہے، اسی لئے یہ دل اس کا مسکن ہیں اور نفرت عیب ہے، برائی ہے، گندگی ہے۔یہی سبب ہے کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں نفرت کو جگہ نہیں ملتی۔اس دنیا میں اگر محبت کو عام کر دیا جائے تو نفرت خود بہ خود ختم ہو جائیگی۔

اِک لفظ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے
سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''عاشق کا دل محبت کا آتش کدہ ہوتا ہے۔جو کچھ اس میں جائے اسے جلا دیتا ہے اور ناچیز کر دیتا ہے کیونکہ عشقِ الٰہی کی آگ (FIRE OF LOVE) سے بڑھ کر کوئی آگ تیز نہیں ہے۔'' (دلیل العارفین، مجلس ۹)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

حضرت شاہ ہمدان سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'ذخیرۃ الملوک' میں حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں:

"اللہ پاک کے نزدیک وہ دل بہت ہی پیارا ہے جو اپنے بھائیوں پر زیادہ نرم اور مشفق ہے۔" (صفحہ ۱۵۷)

محبت پاکیزگی ہے اور نفرت گندگی۔ نفرت اور محبت ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اسی لئے اہلِ تصوف پہلے اپنے دل کو نفرت کی گندگی سے پاک کرتے ہیں تاکہ اس میں محبت کی پاکیزگی سما سکے۔ تصوف تو سراسر محبت کا پیغام دیتا ہے لہٰذا یہاں نفرت کو جگہ نہیں مل سکتی۔ تصوف کی تعلیم اگرچہ اپنے پیدا کرنے والے کی پہچان اور اسکی محبت پر مرکوز ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ اس کے بندوں کے ساتھ محبت، اخلاق اور حسنِ سلوک کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس کائنات اور اسکی ہر چیز کو صوفی اللہ کا پرتو مانتا ہے، اس لئے وہ سب کا احترام کرتا ہے۔ آدمی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی ہر چیز سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ہر یادگار اسے پیاری لگتی ہے۔ اسی طرح صوفی اللہ سے محبت کرتا ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے اللہ کی پیدا کردہ دکھائی دیتی ہے تو وہ اسے اپنے محبوب کی نشانی سمجھ کر اس سے پیار کرتا ہے۔ حضرت بشر حافی ہمیشہ ننگے پیر رہتے تھے، کسی نے سبب پوچھا تو کہنے لگے، یہ زمین اللہ کا بچھونا ہے اس پر جوتے پہن کر کیسے چلا جائے؟

ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدائی ہے

انسان محبت کے لئے پیدا ہوا

انسان کو اللہ نے دنیا میں محبت کے لئے بھیجا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری مخلوقات کو محبت سے وہ نسبت نہیں، کیونکہ اللہ نے انھیں محبت کے احساس سے عاری رکھا ہے۔ آدمی کی فضیلت دوسری مخلوقات پر اسی لئے ہے کہ وہ محبت کا احساس رکھتا ہے۔ اس کا کام محبت کرنا اور محبت پھیلانا ہے۔ یہ دنیا بھی محبت کی جگہ ہے، نفرت کی نہیں۔ اسی لئے اللہ نے آدمی کے وجود میں ایک دل رکھا ہے جو محبت کا تہہ خانہ ہے۔ حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ

اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جانو، کہ دوسری مخلوقات کو محبت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، کیونکہ ان کی ہمتیں بلند نہیں ہیں۔ فرشتوں کا کام جو سیدھے طریقے سے چل رہا ہے وہ اس لئے کہ ان تک محبت کا گزر نہیں ہوا ہے اور یہ اونچ نیچ جو انسان کے ساتھ پیش آیا کرتی ہے، اس لئے ہے کہ اس کو محبت سے سروکار ہے۔'' (مکتوبات صدی، مکتوب ۴۶)

محبت کا احساس انسان کا خاصہ ہے۔ اسی لئے وہ فرشتوں پر بھی برتری رکھتا ہے۔ اگر انسان کے دل کو محبت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کے وجود کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ اس کائنات گیتی پر لاکھوں برسوں سے اللہ کی مخلوقات موجود تھیں مگر انسان کو جب اللہ نے پیدا کرنا چاہا تو ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اس کا سبب کیا تھا؟ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری لکھتے ہیں:

''جب حضرت آدم کی باری آئی تو جہان میں ایک ہلچل مچ گئی۔ فرشتوں نے فریاد کی۔ یہ کیسا حادثہ ہوا کہ ہماری ہزاروں برس کی تسبیح وتہلیل برباد ہو گئی اور ایک مٹی کے پتلے یعنی آدم کو سرفراز کیا اور ہمارے رہتے ہوئے ان کو چنا۔ ایک آواز آئی کہ تم مٹی کو نہ دیکھو اس پاک امانت کو دیکھو یحبھم ویحبونہٗ (اللہ ان سے محبت رکھتا ہے اور وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں) اور محبت کی آگ ان کے دلوں میں سلگائی ہے۔'' (مکتوبات صدی، مکتوب ۴۶)

انسان کو اللہ نے محبت سے پیدا کیا اور محبت والا دل اس کے سینے میں رکھا پھر وہ محبت کے بجائے اگر نفرت دنیا میں پھیلائے تو یہ حیرت کی بات ہے۔ صوفیہ اپنے پیدا کرنے والے کے پیغام کو عام کرنے کے لئے انسان کو محبت کا سبق دیتے ہیں۔ سب سے پہلے آدمی اپنے بنانے والے سے محبت کرے اور جب وہ اپنے خالق سے محبت کرے گا تو دوسری مخلوقات سے بھی محبت کرنے لگے گا، کیونکہ وہ بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ان کے وجود میں غور وفکر آدمی کو خدا کے عرفان تک پہنچا دیتی ہے۔

نفرت کا جواب، محبت

صوفیہ کی جماعت ان پاک بندوں کی جماعت ہے جس نے اپنے رب کا عرفان حاصل کر لیا ہے۔ اسی لئے نفرت کے جواب میں محبت کا برتاؤ حضرات صوفیہ کے ہاں بہت عام رہا ہے

۔انکے عقید تمندوں میں فقیر سے بادشاہ تک بھی ہوا کرتے تھے۔ ہر شخص دل سے انکا احترام کرتا تھا اور صوفیہ کے اسی اخلاق نے سماج میں ایک بڑے بدلاؤ کی بنیاد ڈالی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بلکل ابتدائی عہد کے صوفی ہیں اور تابعی بھی ہیں، ان کا مشہور واقعہ ہے کہ کسی شخص نے آپ کی غیبت کی، جسکی اطلاع آپ کو ملی تو اس کے پاس تازہ کھجوروں سے بھرا طباق بھیجوایا۔ اسی کے ساتھ کہلا بھیجا کہ، میں آپ کا شکر گزار ہوں جو آپ نے میری غیبت کر کے اپنی نیکیوں کو میرے نامہء اعمال میں منتقل کرایا۔ اس احسان کا بدلہ میں نہیں چکا سکتا۔ تاہم یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیے۔ اس سلوک کو دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور آ کر معافی چاہی۔

(بچی حکایات پنجم بحوالہ تذکرۃ الاولیاء)

پیٹھ پیچھے برائی کرنا سماج میں عام ہے، اسکا ردعمل بھی کئی بار انتہائی خطرناک صورت میں دیکھا جاتا ہے۔ دوست واحباب اور رشتے داروں کے بیچ چپقلش اور من مٹاؤ کا سبب اکثر ایک دوسرے کے خلاف شکوہ شکایت کرنا بھی رہتا ہے مگر حضرت حسن بصری جیسا ردعمل شاید ہی کبھی دیکھنے کو ملے۔ یہی فرق ہے ایک صوفی اور عام آدمی میں۔

بد اخلاقی کا جواب، حسن اخلاق

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کا۔ انھوں نے ایک مکان کرایے پر لیا۔ پاس ہی ایک یہودی کا مکان تھا جو اپنے گھر کی گندگی، پرنالے سے بہا دیا کرتا تھا اور وہ گندگی آپ کے گھر میں چلی آتی تھی۔ اُس نے ایک مدت تک ایسا کیا مگر آپ نے کوئی شکایت نہیں کی۔ البتہ آپ خود ہی اسکی صفائی کر دیا کرتے تھے، ایک دن اس نے پوچھا کہ میں جو نالے سے گندگی بہا دیتا ہوں اس سے آپ کو تکلیف نہیں ہوتی؟ آپ نے فرمایا تکلیف تو ہوتی ہے مگر میں نے اسکی صفائی کے لئے ایک جھاڑو اور ایک ٹوکری رکھ چھوڑی ہے، اُسی سے صفائی کر دیتا ہوں۔ ظاہر ہے اس جواب کے بعد اس کے پاس سوائے شرمندگی کے کوئی جواب نہ ہوگا۔

(بچی حکایات پنجم، بحوالہ تذکرۃ الاولیاء)

پڑوسیوں کے بیچ جھگڑے کے جو اسباب ہوتے ہیں ان میں سے ایک بڑا سبب ردعمل ہے، مگر جو ردعمل (RE ACTION) حضرت مالک بن دینار کی طرف سے دیکھنے کو ملا، ایسا ردعمل

ہمارے سماج میں کبھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اگر اسی طرح کا ردعمل پڑوسیوں کی طرف سے ہونے لگے تو تمام جھگڑے ہی تمام ہو جائیں۔

مسئلے خود بخود ختم ہو جائیں گے
اپنی اپنی حدوں میں رہا کیجیے

امام محمد غزالی علیہ الرحمہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

''جان لو آپسی محبت، اچھے اخلاق اور اختلاف بد اخلاقی کا نتیجہ ہے۔ اچھے اخلاق باہم محبت الفت اور موافقت کا سبب ہوتے ہیں اور برے اخلاق سے بغض وعداوت، حسد اور ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنے جیسی برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ جب پیڑ اچھا ہو تو اس کا پھل عمدہ ہوتا ہے۔'' (جلد دوم، صفحہ ۳۶۲)

عظیم مبلغ اسلام اور کشمیر میں روحانی اور سماجی انقلاب برپا کرنے والے حضرت سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب 'ذخیرۃ الملوک' میں لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاھلین (عفو اختیار کرو اور اچھائیوں کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جاؤ۔) جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی تفسیر پوچھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جو شخص بے رحمی سے تجھ سے تعلق توڑے تو مہربانی سے اس کے ساتھ مل جا اور جو تجھ کو بھلائی سے محروم رکھے تو جہاں تک ہو سکے اس پر ایثار ہی کرتا رہ اور جو تجھ پر ظلم کرے تو اس کے ساتھ وفاداری سے برتاؤ کر۔'' (صفحہ ۱۱۲)

محبت اور اچھے اخلاق میں طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت نفرت کو مٹا سکتی ہے اسی لئے یہ حکم ہے کہ جو برائی کرے اس کے ساتھ بھی بھلائی کا برتاؤ کرو، جو تعلق توڑنے کی کوشش کرے، اس کے ساتھ بھی بھلائی کرو اور جو ظلم کرے اس کے ساتھ بھی وفاداری کرو۔ ظاہر ہے کہ محبت، اخلاق، ایثار اور وفاداری کی طاقت، نفرت، بے رحمی، ظلم کو مٹا سکتی ہے۔

گالیوں کے بدلے، دعائیں

اسی طرح کی ایک حکایت حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں میں بھی ملتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک نوجوان بیٹھا سارنگی بجا رہا تھا آپ کا ادھر سے گزر ہوا تو دیکھ کر آپ لاحول پڑھنے لگے وہ اس سے اسقدر آگ بگولہ ہوا کہ سارنگی سے کھینچ کر آپ کے سر پر دے مارا۔ اس سے نہ صرف بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کا سر پھٹ گیا بلکہ اسکی سارنگی بھی ٹوٹ گئی۔ آپ نے اسے کچھ نہ کہا اور گھر جا کر سارنگی کی قیمت کے ساتھ ساتھ کچھ مٹھائیاں بھی اس کے پاس بھیج دیں۔ اور کہلا بھیجا کہ، بھائی تمہاری سارنگی ٹوٹ گئی یہ اسکی قیمت ہے۔ اور سارنگی ٹوٹنے سے جو تمہیں تکلیف ہوئی اسے دور کرنے کے لئے یہ مٹھائی ہے۔ اس اخلاق نے اسے ہمیشہ کے لئے آپ کا گرویدہ بنادیا۔ (یہ واقعہ تذکرۃ الاولیاء اور افضل الفوائد، ملفوظات نظام الدین اولیاء فصل۔ ۲۱ میں درج ہے)

لڑائی جھگڑے اور باہمی منافرت ہمارے سماج کا قابلِ نفرت حصہ ہیں۔ ہمارے قیمتی وقت کا ایک بڑا حصہ اسی طرح کی فضول باتوں میں گزر جاتا ہے۔ تھانہ پولس اور کورٹ، کچہری اسی کی بدولت قائم ہیں۔ عوام کے کروڑوں روپے سالانہ اسی کی نذر ہو جاتے ہیں، لیکن اگر ہم نفرت کا جواب محبت سے دینا سیکھ لیں تو ہمارے کئی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ تصوف میں آدمی کو اسی کے لئے راضی کیا جاتا ہے۔ یہاں محبت ہی محبت ہے، پیار ہی پیار ہے، ایسے میں کہاں کی لڑائی اور کیسا جھگڑا؟

بدگو کو معافی

حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات 'فوائد الفواد'، مرتبہ امیر حسن سنجری میں ایک مجلس کا ذکر ہے:

"حاضرین میں سے ایک نے عرض کیا کہ بعض آدمیوں نے جناب کو ہر موقع پر برا کہا وہ آپکی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں جن کے سننے کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے سب کو معاف کیا تم بھی معاف کر دو اور کسی سے دشمنی نہ کرو۔ بعد ازاں فرمایا کہ چھجو، ساکن اندیپ ہمیشہ مجھے برا بھلا کہا کرتا اور میری برائی کے درپے رہتا۔ برا کہنا سہل ہے لیکن برا چاہنا اس سے برا ہے۔ الغرض جب وہ مر گیا تو میں تیسرے

روز اسکی قبر پر گیا اور دعاء کی کہ پروردگار! جس نے میرے حق میں برا بھلا کہا، میں اس سے درگزرا، تو میری وجہ سے اسے عذاب نہ کرنا۔ اس بارے میں فرمایا کہ اگر دو شخصوں کے مابین رنجش ہو تو دور کر دینی چاہیے۔ اگر ایک شخص دور کر دیگا تو دوسرے کی طرف سے کم تکلیف ہوگی۔،، (جلد ۳، مجلس۔۵)

آدمی کی شخصیت اچھائیوں اور برائیوں سے بنی ہے، وہ کئی بار غیراخلاقی (IMMORAL) کام بھی کرتا ہے مگر اس کی برائی کا جواب اچھائی سے دینے والے کم ہی ملتے ہیں۔ ذرا سوچئے اگر ایک شخص کانٹے بوتا ہے اور اس کے جواب میں دوسرا بھی کانٹے بوئے تو پھر ایک سلسلہ چل پڑے گا اور یہ دنیا کانٹوں سے بھر جائیگی اور کانٹوں کی وجہ سے یہاں گزر بسر ناممکن ہو جائیگا مگر کانٹوں کے جواب میں اگر پھول بوئے جانے لگیں تو کتنا اچھا ہو۔ یہ دنیا گلزار بن جائے اور جنت کا نمونہ لگنے لگے۔

بیٹیوں سے محبت

آج کل سماج میں جس قسم کی نفرتیں عام ہوتی جا رہی ہیں، انھیں کی ایک قسم ہے بیٹیوں سے نفرت۔ بچے اللہ کا تحفہ ہوتے ہیں اور انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے مگر ہمارے ملک میں یہ بات عام ہے کہ لڑکیوں کو پیدائش سے قبل ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ جدید طبی آلات سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ پیدائش سے پہلے بچے کی جنس کی تشخیص ہو سکے۔ بھارت ان ملکوں میں سے ایک ہے جہاں دختر کشی (FEMALE FOETICIDE) کے واقعات سب سے زیادہ ہو رہے ہیں۔ اس کا اثر یہ دیکھنے کو مل رہا ہے کہ ملک کے بعض علاقوں میں لڑکیوں کی تعداد بے حد کم ہو گئی ہے۔ کچھ ضلع تو ایسے ہیں جہاں چھ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی تعداد ہزار لڑکوں کے مقابلے چھ، سات سو کے قریب ہے۔ یہ لڑکیاں اگر کسی طرح پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کے ساتھ دوسرا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے بھید بھاؤ کے ساتھ انکی پرورش کا۔ مگر تصوف کی نظر میں انسان برابر ہیں۔ مرد اور عورت کا فرق ایسا نہیں کہ اس کے چلتے عورتوں کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کیا جائے۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی فرماتے ہیں:

''بیٹیاں اللہ کا تحفہ ہیں، وہ شخص جسے اللہ نے بیٹی دی ہے وہ اسے پیار کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے تو اللہ اس پر راضی اور خوش ہوتا ہے۔ جس نے لڑکی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کیا اللہ

اسے ستر حج کا ثواب دیتا ہے۔ گویا اس نے ستر غلام آزاد کئے۔ جو ماں باپ لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں اور ان پر مہربان ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہوتا ہے اور رحمت فرماتا ہے۔،، (انیس الارواح مجلس۔۱۰)

صدقہ پر زور

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

اللہ کے راستے میں اپنی دولت کو خرچ کرنا صوفیہ کی نظر میں بے حد پسندیدہ رہا ہے ۔قرآن بھلائی تک پہنچنے کا اچھا راستہ صدقہ وخیرات کو بتاتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی کبھی دولت جمع نہیں کی۔ جب آیا اور جو کچھ آیا اسے فوراً خرچ کرڈالا۔ اہل تصوف نے اسی طریقے کو اپنایا اور انسان کے اللہ تک پہنچنے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ دولت جمع کرنے کو بتایا۔ صدقہ انکی نظر میں نہ صرف اللہ کو پسند ہے بلکہ خود رضائے الٰہی کا ذریعہ بھی ہے۔ اس کے ذریعے آدمی اللہ کے بندوں کی خدمت کرتا ہے اور انکی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن بصری کی کتاب آثار الاولیاء کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

> ''صدقہ ایک نور ہے، صدقہ جنت کی حوروں کا زیور ہے اور صدقہ اسی ہزار رکعت نماز سے بہتر ہے جو پڑھی جائے۔ صدقہ دینے والے روزِ حشر عرش کے سائے میں ہونگے۔ جس نے موت سے قبل صدقہ دیا ہوگا وہ اللہ کی رحمت سے دور نہ ہوگا۔ پھر فرمایا صدقہ جنت کی راہ ہے، جو صدقہ دیتا ہے وہ اللہ سے قریب ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ شریف زندنی رحمۃ اللہ علیہ کا لنگر صبح سے رات گئے تک جاری رہتا، جو کوئی آتا کھانا کھا کر جاتا۔'' آپ فرمایا کرتے تھے اگر لنگر میں کچھ نہ ہو تو پانی سے تواضع کرو کوئی خالی نہ جائے''۔

پھر فرمایا زمین بھی سخی آدمی پر فخر کرتی ہے، جب وہ چلتا ہے تو نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہیں۔،، (انیس الارواح، ملفوظات خواجہ عثمان ہارونی، مرتبہ خواجہ معین الدین چشتی مجلس۔۵)

اہلِ تصوف کا صدقے پر زور اس لئے بھی ہے کہ وہ انسان کی خدمت اور اسکی محبت کو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ مانتے ہیں۔صوفیہ کی خانقاہوں میں لنگر کا انتظام ہوتا تھا، یہ لنگر عام لوگوں کے لئے ہوتا تھا۔کوئی بھی اس میں آکر کھانا کھاسکتا تھا۔آنے والے سے اسکا مذہب اور اسکی ذات نہیں پوچھی جاتی تھی۔اسکے رنگ اور نسل پر نظر نہیں رکھی جاتی تھی۔یہاں ہر آدمی برابر ہوتا تھا ۔بھارت کے تناظر میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جہاں ذات پات اور اونچ نیچ کا بھید بھاؤ صدیوں سے چلا آرہا تھا۔دلتوں اور پست ذاتوں کو برابری کی جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ایسے میں لنگر میں آکر سب کا برابر ہو جانا صوفیہ کے پیغام محبت واخوت کی مثال ہے اور یہی اسباب تھے کہ اسلام قبول کرنے والوں میں سب سے بڑی تعداد پسماندہ ذاتوں کی تھی۔

بندہ و صاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

تصوف کی نظر میں انسان کی حیثیت

سلام اس پر کہ جس نے، دشمنوں کو بھی قبائیں دیں
سلام اس پر کہ جس نے گالیاں کھاکر دعائیں دیں

اوپر مذکور واقعات حسنِ اخلاق کی بہترین مثال ہیں۔کون ہے جو بداخلاقی کا جواب خوش اخلاقی سے دیتا ہے؟ کون ہے جو نفرت کے جواب میں محبت نچھاور کرتا ہے؟ کون ہے جو گالیوں کا جواب دعاؤں سے دیتا ہے؟ کون ہے جو راستے میں کانٹے بچھانے والوں کے لئے پھولوں کے بستر پیش کرتا ہے؟ یقیناً یہ صوفیاء کرام ہیں۔انھیں کی تعلیمات نے سماج کو جوڑا ہے۔آج بھی ان کے آستانے اگر سبھی مذاہب کے ماننے والوں کا مرکز ہیں تو وہ یونہی نہیں۔اس قسم کا اخلاق دنیا کو جوڑتا ہے۔انسان، انسان کے بیچ محبت اور اخوت پیدا کرتا ہے۔آدمی کو آدمی کے قریب لاتا ہے ۔صوفیہ کی نظر میں تمام انسان اللہ کی فیملی کے ممبر ہیں، جنھیں عیال اللہ بھی کہا گیا ہے۔ظاہر ہے جب آپ کسی انسان کے بارے میں یہ سوچ رکھیں گے تو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ بھی کریں گے۔کوئی بھی شخص اگر انسان کو اللہ کی فیملی کا ممبر سمجھے تو اس کے ساتھ برا سلوک نہیں کرسکتا۔ تصوف کی نظر میں انسان قابلِ احترام ہے وہ خواہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، کسی بھی مسلک پہ

عمل پیرا ہو، کسی بھی خطۂ زمین سے تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی تہذیبی پسِ منظر (BACKGROND) سے ہو۔ ذات پات، رنگ و نسل، علاقائی اور جغرافیائی حد بندیاں تصوف کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، کیونکہ اسکی بنیاد انسانیت پر ہے۔

جانوروں کے ساتھ حسن سلوک

صوفیہ انسان ہی نہیں جانوروں کو بھی قابلِ احترام اور باعثِ عبرت سمجھتے ہیں۔ تصوف میں انسان ہی نہیں دیگر جانداروں کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ صوفیہ کی زندگی میں ایسے واقعات بہ کثرت ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ابتدائی دور کے صوفی حضرت بایزید بسطامی کا بھی تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ایک مرتبہ آپ ایک تنگ گلی سے اپنے مریدوں کے ساتھ گزر رہے تھے کہ دوسری جانب سے ایک کتا آتا نظر آیا، جب کتا سامنے آیا تو بایزید بسطامی علیہ الرحمہ واپس مڑ گئے اور کتے کے لئے راستہ خالی کر دیا۔ مریدوں میں سے ایک کے دل میں یہ خیال آیا کہ انسان تو تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہے۔ اسے اللہ نے دوسرے جانداروں سے بہتر بنایا ہے ایسے میں کتے کے لئے راستہ چھوڑنے کا کیا مطلب ہے؟ حضرت بایزید نے گویا کتے کو انسان پر ترجیح دیدی۔ مرید کے اس خیال سے واقف ہو کر حضرت بایزید نے فرمایا کہ اس کتے نے زبان حال سے مجھ سے کہا کہ اے بایزید یہ سب اللہ کی شان ہے کہ اس نے ازل میں مجھے کتا اور تمہیں انسان بنایا ۔ پھر آپ کو سلطان العارفین بنایا ۔ میں بھی اسی کی مخلوق (CREATION) ہوں جسکی مخلوق آپ ہیں۔ کتے کی اس بات سے میں پریشان ہو گیا اور اسے راستہ دینے کے لئے پیچھے مڑ گیا۔ (نجی حکایات، پنجم، بحوالہ تذکرۃ الاولیاء)

انسان، جانور، پیڑ، پودے اور دنیا کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔ وہ چاہتا تو ہمیں انسان کے بجائے جانور بھی بنا سکتا تھا مگر یہ اس کا احسان ہے کہ ہمیں انسان بنایا اور سوچنے سمجھنے کی طاقت دی۔ اس کا یہ احسان ہمیں یاد رکھنا چاہئے اور دوسرے جانداروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔ یہ انسان کے طور پر ہماری ذمہ داری بھی ہے۔

جہاں تک گوشت کے لئے جانوروں کو ذبح کرنے کا مسئلہ ہے تو اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ، آدمی کی خوراک سبزی اور گوشت دونوں ہیں۔ دوسرے کئی جاندار صرف گوشت

کھاتے ہیں۔یعنی انھیں قدرتی طور پر گوشت خور بنایا گیا ہے۔جسکی جو خوراک ہے وہ وہی کھایگا ،اسی طرح دنیا کے کچھ خطے ایسے ہیں جہاں صرف گوشت دستیاب ہوتا ہے۔زمین کھیتی کے لائق نہیں۔ایسے علاقوں میں انسانی زندگی کا انحصار صرف گوشت پر ہوتا ہے۔البتہ صرف اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے جانوروں کا شکار کرنا،یا انھیں ستانا کسی طرح درست نہیں۔خواجہ عثمان ہارونی نے ایک حدیث کے حوالے سے فرمایا:

''جو شخص خواہش نفس کے لئے جانور تلف کرے،گویا اس نے خانہ کعبہ ویران کرنے کی کوشش کی،مگر جہاں جانور ذبح کرنا ہے اگر وہاں کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔۔۔پھر فرمایا فرمانِ مصطفوی ہے کہ جس شخص نے کسی جانور کو آگ میں پھینکا یا بے رحمی سے مارڈالا اس کا کفارہ یہ ہے کہ غلام آزاد کرے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا لگاتار دوماہ کے روزے رکھے۔'' (انیس الارواح،مجلس۔۱۱)

امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تصنیف مکاشفۃ القلوب میں لکھا ہے:

''فرمانِ حضور اکرم ﷺ ہے مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں اور وہ جانوروں پر رحم کرے،ان سے انکی طاقت کے مطابق کام لے۔'' (باب۔۱۸)

جانوروں کے ساتھ جہاں اچھا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی جاتی ہو،وہاں انسانوں کا کیا مقام ہوگا،سمجھا جاسکتا ہے۔اوپر کی حدیث سے ظاہر ہے کہ مکمل مسلمان وہی ہوتا ہے جو صرف انسان ہی نہیں جانوروں کے ساتھ بھی مہربانی کا سلوک کرتا ہے۔اوپر کی حدیث میں عام لوگوں کی بات کی گئی ہے،صرف مسلمانوں کی بات نہیں ہے۔سچ تو یہ ہے کہ جہاں جانوروں پر بھی مہربانی کی بات ہو وہاں انسان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ مکاشفۃ القلوب میں ہی ایک اور حدیث درج ہے،جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جانوروں کے ساتھ مہربانی بھرا برتاؤ کرنا کتنا اچھا کام ہے:

''حضور ﷺ کا فرمان ہے،ایک شخص سفر میں جارہا تھا کہ اسے راستے میں سخت پیاس لگی، اسے قریب ہی ایک کنواں نظر آیا،جب کنویں سے پانی پی کر چلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کے مارے زبان نکالے پڑا ہے۔اسے خیال آیا کہ اسے بھی میری طرح پیاس لگی ہوگی وہ واپس گیا،منہ میں پانی بھر کر اس کے پاس آیا اور اسے پلا دیا،اللہ تعالیٰ نے محض اسی رحم کی

بدولت اس کے گناہوں کو معاف کر دیا۔" (باب۔۱۸)

اسی طرح ایک موقع پر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جانوروں پر مہربانی کرنے سے ہمیں ثواب ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہر جاندار پر رحم کرنے کا بدلہ ملتا ہے۔ (ایضا)

صحابی رسول حضرت ابی الدرداء رضی اللہ عنہ بچوں سے پڑیاں خرید کر انھیں چھوڑ دیا کرتے تھے اور فرماتے جاؤ آزادی کی زندگی بسر کرو۔ (ایضا)

امام ابوالقاسم عبدالکریم قشیری نے لکھا ہے:

"کہتے ہیں عبداللہ بن جعفر اپنی جاگیر کی طرف گئے تو کسی کے نخلستان میں قیام کیا۔ وہاں ایک حبشی غلام ہوتا تھا۔ غلام کا کھانا آیا تو ایک کتا باغ میں گھس کر غلام کے قریب آ گیا۔ غلام نے پہلے ایک روٹی اسے ڈالی، جسے کتے نے کھالیا۔ پھر دوسری اور تیسری بھی ڈال دی۔ کتے نے انھیں بھی کھالیا۔ عبداللہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ عبداللہ نے غلام سے پوچھا کہ تیری ایک دن کی خوراک کتنی ہے؟ غلام نے کہا! جتنی آپ نے دیکھی ہے۔ عبداللہ نے کہا تم نے کتے کو کیوں دے دی؟ غلام نے کہا کہ یہ کتوں کا علاقہ نہیں ہے۔ یہ کتا دور سے مسافت طے کر کے آیا تھا اور بھوکا تھا۔ اس لئے میں نے اسے مایوس کرنا پسند نہ کیا۔ عبداللہ نے پوچھا آج تو کیا کرے گا؟ جواب دیا آج بھوکا رہونگا۔ یہ جواب سن کر عبداللہ بن جعفر نے کہا، کیا مجھے سخاوت کرنے پر ملامت کی جاتی ہے؟ یہ تو مجھ سے زیادہ سخی ہے پھر اس باغ اور غلام کو تمام آلات کے ساتھ خرید لیا اور غلام کو آزاد کر کے سب کچھ اسے دے دیا۔" (ترجمہ رسالہ قشیریہ، صفحہ۔۴۶۸)

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد شاہ عبدالرحیم علیہ الرحمہ کے بارے میں تحریر کیا ہے جو اپنے دور کے ایک معروف صوفی گزرے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"فرمایا (شاہ عبدالرحیم نے) ایک دفعہ اکبرآباد میں میں بارش ہوئی اور ہواؤں کے موسم میں سوار ہو کر جا رہا تھا۔ دیکھا کہ راستے میں ایک جگہ کتے کا پلا دلدل میں ڈوب رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی دردناک آواز سے میرا دل بھر آیا۔ میں نے خادم سے کہا کہ جلدی جاؤ اور اس پلے کو باہر نکالو۔ اس نے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے انکار کیا۔ میں جلدی جلدی گھوڑے سے اترا، کپڑے اوپر چڑھائے اور پانی میں اترنے کے لئے آگے بڑھا۔ خادم نے جب یہ

صورتحال دیکھی تو چارونا چار وہ خود آگے بڑھا اور پلے کو باہر نکال لایا۔ قریب ہی ایک حمام تھا وہاں سے گرم پانی لے کر میں نے اس کو نہلایا، طباخی سے روٹی اور شوربا لے کر اسے خوب کھلایا۔ پھر میں نے کہا یہ کتا اس محلے کا ہے، اگر اس محلے والے اس کی خبر گیری کا ذمہ اٹھائیں تو بہتر ورنہ ہم اس کو اپنے محلے میں لے جائیں گے۔ طباخی نے اس کی ذمہ داری قبول کر لی، چنانچہ یہ کتا اس کے حوالے کر کے میں رخصت ہو گیا۔" (انفاس العارفین، صفحہ ۱۱۸)

انسان خود انسان کی عزت و آبرو کو نہیں سمجھ رہا ہے، ایسے میں وہ کسی جانور اور وہ بھی ذلیل ترین جانور کی آبرو کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔؟ حقیقت میں انسان وہی ہے جو جانوروں کے حقوق کا بھی خیال رکھے۔ جانوروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کے خلاف آج دنیا کے کئی ملکوں میں بیداری آرہی ہے اور محبانِ جانوراں (ANIMAL LOVERS) اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں مگر صدیوں قبل جب اس طرح کا کوئی تصور نہیں تھا تب بھی صوفیہ کے ہاں جانوروں کے احترام اور انکے حقوق کا خیال موجود تھا۔ انسانی شرافت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی تمام جانوں کا احترام کیا جائے انھیں نہ ستایا جائے۔ ہر جگہ اسی کا نور ہے۔ ہر چیز اس کے ہونے کی دلیل ہے۔ کائنات (UNIVERSE) کا ذرہ ذرہ اس کی کبریائی اور اسکی قدرت کا ہمیں احساس کراتا ہے۔ فارسی کے مقبول ترین شاعر اور صوفی، سعدی شیرازی کہتے ہیں:

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اس دنیا میں انسان کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے جانور بھی رہتے ہیں اور انکے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ اہل تصوف میں مشہور رہا ہے۔ اسے حضرت خواجہ عثمان ہارونی نے بھی اپنی ایک مجلس میں بیان فرمایا اور خواجہ معین الدین چشتی نے ان کے ملفوظات کے مجموعے، انیس الارواح میں نقل کیا ہے۔ واقعہ یوں ہے:

"ایک دفعہ ایک یہودی کتے کو روٹی کا ٹکڑا کھلا رہا تھا۔ خواجہ حسن بصری کا اس وقت گزر ہوا۔ آپ نے یہودی سے پوچھا کہ تو مسلم ہے یا غیر مسلم؟ اس نے کہا کہ غیر مسلم! آپ نے کہا کہ تمہاری خدمتِ خلق قبول نہ ہوگی۔ یہودی نے کہا کہ نہ ہو وہ (اللہ) تو دیکھتا ہے۔ ایک عرصہ بعد خواجہ حسن بصری نے دیکھا کہ خانہ کعبہ کے پرنالے کے نیچے ایک شخص کہہ

رہا ہے، یارب! اور پرنالے کے قریب سے آواز آتی ہے، اے میرے بندے میں حاضر ہوں۔ خواجہ صاحب کو خیال آیا کہ دیکھوں یہ کون بلند مرتبہ ہے؟ اس نے کہا آپ نے پہچانا؟ آپ نے نفی میں جواب دیا تو اس شخص نے کہا میں وہی ہوں، جس کی خیرات اللہ نے قبول کرلی اور اپنے پاس بلالیا۔" (مجلس۔۵)

صوفیہ کے ہاں ایک حدیث کا بھی بہت ذکر ملتا ہے کہ قیامت کے دن ایک عورت کو صرف اس لئے جنت ملیگی کہ اس نے ایک پیاس سے دم توڑتی بلی کو پانی پلایا ہوگا۔ یہ اور اس طرح کی باتیں صوفیہ کی محفلوں میں ہوتی رہتی تھیں اور ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو تمام جانداروں کے ساتھ حسنِ سلوک پر مائل کیا جائے۔

محبت ہے تو دنیا ہے

محبت دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ دنیا کے وجود کا سبب محبت ہے۔ محبت نہ ہو تو دنیا کا وجود نہ ہو۔ زمین وآسمان نہ ہوں، چاند ستارے نہ ہوں سمندر و پہاڑ نہ ہوں جھرنے و آبشار نہ ہوں، پیڑ پودوں کا وجود نہ ہو، کلیوں میں حسن نہ ہو، پھولوں پہ نکھار نہ ہو، باغ و بہار نہ ہو، سپنوں کا سنسار نہ ہو، جمادات وحیوانات کا وجود نہ ہو، فضائی کائنات نہ ہو۔ والدین اپنے بچوں کی پرورش نہ کریں، پرندے اپنے چوزوں کو دانے نہ کھلائیں، درندے شکار نہ کریں اور چرندچارے نہ کھائیں اور کھلائیں۔ کبھی غور تو کرو انسان لاڈو پیار سے اپنے بچوں کی پرورش کیوں کرتا ہے؟ چڑیاں اکیس دن تک اپنے انڈے کیوں سیتی ہیں؟ جانور اپنی جان پر کھیل کر اپنے بچوں کی حفاظت کیوں کرتے ہیں؟ ہاتھیوں کا پورا جھنڈ ایک نوزائیدہ بچے کو تحفظ کیوں دیتا ہے؟ گوشت خور شیر اور چیتے اپنے بچوں کو کیوں نہیں کھاتے؟ ظاہر ہے یہ سب محبت کے سبب ہے۔ ہر جگہ محبت کی جلوہ گری ہے۔ یہ محبت اگر کسی کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر اکساتی ہے تو کسی کو جان بچانے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ انسانی معاشرہ ہو یا جنگل کی زندگی ہر جگہ کسی نہ کسی روپ میں اس جذبے کی کارفرمائی ضرور مل جاتی ہے۔ یہ جذبہ ہی انسانی معاشرے کو ٹوٹ پھوٹ سے بچاتا ہے اور یہی جذبہ جانوروں کو گروہی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ انسان، جانور، پیڑ پودے اور کائنات کا ذرہ ذرہ ایک پیدا کرنے والے کے احکام کا پابند ہے اسی خالق و مالک نے سب کو محبت کا

جذبہ عطا فرمایا اور اسی جذبے کے سبب سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ محبت کا جذبہ گو عام ہے مگر اخلاق ومروت کی صفات تو انسانوں تک ہی محدود ہیں۔ یہ اور اس جیسی کچھ دیگر خصوصیات انسان کو دوسری مخلوقات سے الگ کرتی ہیں۔ اسے اشرفیت کا بلند مقام عطا کرتی ہیں اور اسے فرشتوں میں بھی ممتاز کرتی ہیں۔ تصوف میں انھیں انسانی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ محبت اور اخلاق کا یہ جذبہ نہ صرف ہماری شخصیت کی تعمیر میں اِک اہم رول ادا کرتا ہے بلکہ ہمارے معاشرے کو بھی امن وامان کا گہوارہ بناتا ہے۔ اگر محبت اور اخلاق کے جذبات سماج میں عام ہو جائیں تو تمام سماجی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں اور یہ معاشرہ جو آج دہشت گردی، بدعنوانی، رشوت ستانی، تشدد، خونریزی اور بیشمار اخلاقی خرابیوں کا سامنا کر رہا ہے ایک صالح اور اچھا معاشرہ بن جائے۔

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

آج ہماری ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ہم تعلیم کا مقصد صرف روزگار حاصل کرنا سمجھنے لگے ہیں ،اچھا انسان بنانا نہیں۔ اس تعلیم کا آخر کیا فائدہ جو انسان کو انسان نہ رہنے دے، انسان کو ایک مہذب جانور (CULTURED ANIMAL) بنا کر چھوڑ دے؟ اس تربیت سے کیا حاصل جو اسے محض پیٹ بھرنے کا ذریعہ فراہم کرے اور روزی دینے والے سے غافل کر دے؟ وہ سیاست کس کام کی جو انسان کو آزادی کی بجائے طوقِ غلامی پہنا دے؟ اس تعلیم سے کیا حاصل جو دوسروں کے وسائل اور حقوق پر شبخون مارنا سکھائے؟ وہ سائنس کس کام کی جو انسان کو زندگی کے بجائے اجتماعی موت فراہم کرے؟

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آکھر پریم کے، پڑھے سو پنڈت ہوئے

ڈھائی آکھر کا جلوہ

''پریم کے ڈھائی آکھر،، ہی ہمارے وجود کا مقصد ہیں اور وجود کا سبب بھی۔ انھیں ڈھائی لفظوں میں گھری ہوئی ہے کائنات او[illegible] کے گرد گھوم رہے ہیں تمام سیارے اور ستارے۔ اس کے

بغیر چاند اور سورج اپنی روشنی کھودیں، ستارے اپنی دلکشی کھودیں، سیارے اپنی زندگی کھودیں، پھول اپنی تازگی کھودیں اور پودے اپنی شادابی کھودیں۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ افراد جو اپنے دلوں کی حویلیوں کو محبت کی روشنی سے جگمگائے رکھتے ہیں۔ مشہور صوفی اور عالم امام محمد غزالی لکھتے ہیں:

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے خاص بندوں کو فضل وکرم کی چادر سے ڈھانپ لیا اور انکے دلوں میں محبت ڈال دی، حتا کہ وہ اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور ان کے دلوں سے کینہ نکال باہر کیا چنانچہ وہ دنیا میں ایک دوسرے کے دوست اور آخرت میں رفیق وخلیل ہونگے۔'' (احیاء العلوم، حصہ دوم، صفحہ ۳۶۱)

یہ محبت اخلاق اور بھائی چارہ ہی تمام آسمانی مذاہب کا پیغام ہے، اسی کی تعلیم کے لئے اللہ کے پیغمبروں کی آمد ہوئی اور اسی کی دعوت کے لئے رسولوں کی بعثت ہوئی۔ تصوف کا بھی یہی پیغام ہے کہ اللہ کے بندوں کو آپس میں محبت اور بھائی چارہ کا برتاؤ کرنا چاہئے ہر دور میں صوفیاء نے دنیا کو یہی تعلیم دی اور خود بھی اسی پر کاربند رہے۔ ان کے نزدیک انسان قابلِ احترام اور لائقِ محبت تھا وہ خواہ کسی بھی مذہب، ذات، علاقے اور رنگ ونسل کا ہو۔ اسی پیغامِ محبت نے ایک دنیا کو تصوف کا گرویدہ بنادیا اور اسے ساری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ صوفیاء نے اللہ کے بندوں کی محبت اور انکی خدمت کو رضائے الٰہی کا ذریعہ سمجھا۔ انھوں نے مخلوق میں خالق کا جلوہ دیکھا۔ صانع کو صنائع میں ڈھونڈا۔ نقاشِ فطرت کے نقوش کو اس کی فنکاری (ARTS) میں تلاش کیا۔

ہر گیاہے کہ از زمیں روید
وحدہٗ لاشریک می گوید

محبت کیسے؟

صوفیاء اچھے اخلاق کو محبت کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور برے اخلاق کو اختلاف کا سبب۔ ظاہر ہے کہ اچھے اخلاق سے محبت بڑھتی ہے اور برے اخلاق سے نفرت، حسد اور کینہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ سماج میں بہتری کا سبب بنتے ہیں اچھے اخلاق جبکہ نفرت کینہ اور بغض وحسد ایک اچھے سماج کو بھی بگاڑ سکتے ہیں۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ آم کا پیڑ آم کا پھل دیتا ہے اور ببول کا پیڑ کانٹے دیتا ہے۔ حدیثِ رسول ہے کہ:

''میزانِ عدل پر سب سے زیادہ وزنی چیز جو رکھی جائیگی وہ اچھے اخلاق ہیں،،

(سنن ابوداؤد، جلد دوم، کتاب الادب)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

''جو تم سے رشتہ توڑے اس سے رشتہ جوڑو، جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کردو اور جو تمھیں نہ دے اسے تم دو۔'' (شعب الایمان، جلد ششم، صفحہ ۲۶۱)

اوپر کی عبارت کو اگر سرسری طور پر پڑھ کر گزر گئے ہوں تو دوبارہ پڑھیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی قسم کے اخلاق نے جانی دشمنوں کو بھی محبت کرنے والا دوست بنا دیا تھا اور یہی اخلاقی تعلیمات تصوف کی روح ہیں۔ صوفیہ نے اسی اخلاق کی تبلیغ کی۔

اخلاق کے تعلق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث ہیں، مگر یہاں صرف دو حدیثیں ملاحظہ فرمائیں:

''مومن محبت کرنے والا ہوتا ہے اور اس سے محبت کی جاتی ہے، جو لوگ دوسروں سے محبت نہیں کرتے اور نہ ان سے محبت کی جاتی ہے ان میں کوئی بھلائی نہیں۔،،

(تاریخ ابنِ عساکر، جلد سوم، صفحہ ۲۲)

''اللہ تعالیٰ جس سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے اچھا دوست دیدیتا ہے، اگر یہ بھول جائے تو وہ اسے یاد دلاتا ہے اور اگر اسے یاد ہو تو وہ اسکی مدد کرتا ہے۔،،

(سنن ابی داؤد، جلد دوم، صفحہ ۱۵، کتب الخروج)

اوپر کی سبھی حدیثوں میں محبت کی بات کہی گئی ہے، محبت کا دائرہ کسی خاص علاقے، مذہب، ذات اور نسل تک محدود نہیں ہے، بلکہ عام ہے۔ یعنی آدمی کی محبت سب کے لئے عام ہونی چاہیے۔ اگلا کسی بھی مذہب کا ہو، کسی بھی علاقے کا ہو، کسی بھی رنگ و نسل کا ہو اس سے محبت کرنا خیر خواہی کرنا اور اسکے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ایک اچھے مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ صوفیہ نے اسی پر سب سے زیادہ زور دیا۔ اسلام کا ایک شعبہ شریعت ہے جس پر عمل کی علماء تلقین کرتے رہے ہیں، شریعت کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم، مگر اسی کے ساتھ اخلاقیات کی اہمیت بھی ہے اور اخلاقیات کے بغیر مذہب ایک بے روح جسم بن کر رہ جاتا ہے۔ شریعت تو مذہبی قوانین کا مجموعہ ہے، اور زندگی و سماج کے لئے یقیناً قانون کی ضرورت ہے، مگر اخلاقیات (MORAL VALUES) کی

ضرورت ہے ان قوانین کی آتما کو سمجھنے کے لئے۔ مثلا اسلام نے اپنے مال سے ڈھائی فیصد زکوۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے، وہ مال جس پر ایک سال گزر جائے اسی پر یہ حکم لاگو ہوگا۔ یہ حکمِ شریعت ہے، مگر اہلِ طریقت کا کہنا ہے کہ ایک سال تک مال بچا کر کیوں رکھا جائے کہ اس پر زکوۃ واجب ہو؟ اگر مال آئے تو اسی وقت اسے اللہ کے راستے میں خرچ کر دیا جائے۔ اسکا مظاہرہ بار بار رسول ﷺ کی سیرت میں نظر آتا ہے۔

آج دنیا کا کوئی بھی ملک آئین سے عاری نہیں، مگر جو مسائل درپیش ہیں وہ اخلاقیات سے عاری سماج اور قانون نافذ کرنے والوں کے سبب ہیں۔ آج اگر کسی کو حکومت مل جاتی ہے تو وہ عوام کے حقوق کو سلب کرنے کی سوچتا ہے، جنتا کی دولت کو لوٹ کر عیش کرتا ہے، انصاف کے خلاف فیصلے کرتا ہے، یقیناً یہ سب اخلاقیات سے عاری ہونے کی وجہ سے ہے۔ تصوف کا اصل میدان یہی اخلاقیات کا شعبہ ہے۔ اگر آدمی کی روح پاکیزہ ہو جائے تو جسم کے پاکیزہ ہونے میں کیا دیر؟ اور اگر روح و جسم پاکیزہ ہو جائیں تو سماج یقیناً صاف ستھرا ہو جائیگا، امن وامان کا گہوارہ ہو جائے گا۔

محبت سماج کو جوڑنے والی چیز ہے۔ دشمن کو بھی دوست بنانے والی چیز ہے۔ اسی لئے تصوف میں سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے محبت پر۔ بھائی چارے پر۔ ایک دوسرے کی غمخواری پر۔ اپنے عہد کے معروف صوفی حضرت ابوحمزہ بغدادی کا قول ہے:

> ''جب تمہارا جسم تم سے سلامتی پائے تو جان لو کہ تم نے اس کا حق ادا کر دیا اور جب لوگ تم سے محفوظ رہیں تو جان لو کہ تم نے ان کا حق ادا کر دیا۔'' (کشف المحجوب، صفحہ ۲۳۰)

یعنی خود کو سلامت رکھنا اپنے جسم کا حق ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی دوسروں کی بھی بھلائی چاہے۔ یہ دوسرں کا حق ہے کہ وہ ہماری اذیت اور تکلیف سے محفوظ رہیں۔ سماج کی خیر خواہی اور خدا کے بندوں کی بھلائی، یہ وہ انسانی صفات ہیں جن پر تصوف میں خاص دھیان دیا جاتا ہے اور انھیں عبادت تصور کیا جاتا ہے۔

یہی ہے عبادت ، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

خدمتِ خلق سے محبت پھیلتی ہے

خدمتِ خلق یعنی انسان کی خدمت اور لوگوں کی سیوا صوفیوں کا طریقہ رہا ہے۔ وہ اپنی خانقاہوں سے کئی کام خدمت کے جذبے سے کرتے تھے۔ خانقاہوں نے سماج سیوا کی ایسی ایسی مثالیں قائم کیں، جو بادشاہوں اور امیروں کے لئے بھی ناممکن تھیں۔ ایسی خانقاہیں ان سبھی ممالک میں پھیلی تھیں، جہاں صوفیہ تھے، انکے نظریات وخیالات تھے اور تصوف کے سلاسل موجود تھے۔ دلّی کی سب سے مشہور خانقاہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ تھی جس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ اس خانقاہ کی طرف سے روزانہ ہزاروں افراد کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ جو غریب ونادار نہیں آسکتے تھے، ان کے گھر کھانا بھیج دیا جاتا تھا۔ کئی غریب خاندانوں کے لئے وظیفے مقرر تھے جو پابندی کے ساتھ ہر مہینے انھیں بھیج دیئے جاتے تھے۔ علماء، حفاظ اور فقراء ومساکین کی مدد کے لئے ہمیشہ دروازہ کھلا رہتا۔ علم حاصل کرنے والے طلباء کے اخراجات خانقاہ سے ہی پورے کئے جاتے تھے۔ جو غریب خاندان دلی سے دور جنوبی ہند میں تھے انکی مدد کے لئے بھی یہاں سے پیسے بھیج دیئے جاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ خانقاہ کی طرف مدد کے لئے دیکھتے تھے۔ اس خانقاہ کی یہ حالت تھی کہ ہر جمعہ کو جھاڑو پھیر دیا جاتا تھا اور کوئی بھی چیز باقی نہیں چھوڑی جاتی تھی جو کچھ بھی بچا کھچا ہوتا اسے خیرات کردیا جاتا تھا۔ یہ روایت صرف اسی خانقاہ کی نہیں تھی دیگر خانقاہوں میں بھی اسی قسم کی سماجی خدمات کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے پیچھے صوفیہ کی خاص سوچ تھی، جسکی جھلک خواجہ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان میں ملتی ہے:

> ”جب کوئی پیاسے کو پانی پلاتا ہے، اس وقت اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، اگر وہ مرجائے تو اس کا شمار شہداء میں ہوگا۔ پھر فرمایا جو شخص بھوکے کو کھانا کھلائے اللہ اسکی ہزار حاجتوں کو پورا کرتا ہے اور جہنم کی آگ سے اسے آزاد کرتا ہے، اور جنت میں اس کے لئے ایک محل مخصوص کرتا ہے۔“ (انیس الارواح، مجلس۔۱۰)

ایک دوسری جگہ خواجہ عثمان ہارونی کا ہی قول درج ہے:

> ”میں نے خواجہ مودود چشتی کی زبانی سنا کہ اللہ تعالیٰ تین گروہوں کی طرف نظر رحمت فرماتا

ہے، پہلے وہ باہمت لوگ جو محنت کر کے اپنے کنبہ کو پالتے ہیں۔ دوسرے جو اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کا حکم مانتی ہیں۔ تیسرے وہ جو فقیروں اور عاجزوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔'' (انیس الارواح، مجلس۔۲۰)

اسی طرح حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''کھانا کھلانا سبھی مذاہب میں پسندیدہ ہے۔'' (فوائد الفواد، جلد۔۱، مجلس۔۱۷)

اس قسم کے اقوال صوفیہ کے ملفوظات اور انکی کتابوں میں بہت زیادہ ملتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خدمت خلق کو کتنا پسند کرتے ہیں۔ وہ اس خدمت کو نہ صرف خدا تک پہونچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے بلکہ وہ اسے انسانوں میں محبت اور بھائی چارہ کی اشاعت کا ذریعہ بھی تصور کرتے تھے۔ خدمتِ خلق کو صوفیاء کے حلقے میں کس قدر اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ حضرت مخدوم شیخ شرف الدین یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مکتوب سے ملتا ہے۔ اس خط کا ایک حصہ پیش ہے:

''خدمت کرنے میں بڑے بڑے فوائد ہیں اور کچھ ایسی خاصیتیں ہیں جو اور کسی عبادت میں نہیں۔ ایک تو یہ کہ نفس سرکش مرجاتا ہے اور بڑائی کا گھمنڈ دماغ سے نکل جاتا ہے، عاجزی اور تواضع آجاتی ہے۔ اچھے اخلاق، تہذیب اور آداب آجاتے ہیں۔ سنت اور طریقت کے علوم سکھاتی ہے۔ نفس کی گرانی اور ظلمت دور ہو کر روح سبک اور لطیف ہوجاتی ہے۔ آدمی کا ظاہر و باطن صاف اور روشن ہوجاتا ہے۔ یہ سب فائدے خدمتِ خلق ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ ایک بزرگ سے پوچھا گیا خدا تک پہنچنے کے لئے کتنے راستے ہیں؟ جواب دیا موجودات عالم کا ہر ذرہ خدا تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے، مگر کوئی راہ نزدیک تر اور بہتر خلقِ خدا کو راحت و آرام پہنچانے سے بڑھ کر نہیں ہے، اور ہم تو اسی راستے پر چل کر اس منزل تک پہنچے ہیں اور اپنے مریدوں کو بھی اسی کی وصیت کرتے ہیں۔ انھیں بزرگوں کا کہا ہوا ہے کہ اس گروہ کے ورد، وظائف اور عبادتیں اتنی ہیں جو بیان نہیں کی جاسکتیں، مگر کوئی عبادت افضل اور مفید تر خدمتِ خلق سے نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت پیغمبر اسلام ﷺ سے روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا کون سا صدقہ زیادہ افضل ہے؟ فرمایا بندے کی خدمت کرنا خدا کی راہ میں، یا سایے کی غرض سے خدا کے راستے میں شامیانے لگانا، خیمے نصب کرنا یا خدا کی راہ میں اونٹ یا کشتی دینا۔ ایک اور دوسری جگہ

ارشاد ہوا۔ بیوہ عورتوں کے کام میں دوڑنا اور غریبوں، مسکینوں کی خدمت بجالانا ایک مجاہدے کی طرح ہے خدا کی راہ میں۔ یا ان لوگوں کی طرح ہے جو دن کو روزے رکھتے ہیں اور راتوں کو عبادت کرتے ہیں۔" (مکتوباتِ صدی، مکتوب ۷۱)

حضرت مخدوم بہاری علیہ الرحمہ نے خدمتِ خلق کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ یہ ان کا ایک طویل خط ہے اور یہ پورا خط ہی اس کی فضیلت میں ہے۔ وہ خود بھی پٹنہ سے قریب بہار شریف کے علاقے میں مقیم رہے اور اپنی پوری زندگی عوامی خدمات میں لگادی۔ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر میں اللہ کے بندوں کی خدمت کرنا کتنا بڑا کام ہے۔ صوفیوں کے ہاں خدمتِ خلق کی روایت ابتداء سے ہی رہی ہے اور وہ اسے نہ صرف خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے رہے ہیں بلکہ وہ اس کے ذریعے محبت اور بھائی چارے کا پرچار بھی کرتے رہے ہیں۔

مذہب، بھائی چارے میں رکاوٹ نہیں

مذہب انسان دوستی کا سبق دیتا ہے۔ یہ آدمی کو آدمی سے جوڑنے کی بات کرتا ہے، اور تصوف مذہب کی روح ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے ادھورا ہے اسی طرح مذہب بغیر روحانیت کے نامکمل ہے۔ تصوف محبت کی بات کرتا ہے، یہ کبھی مذہب اور رنگ ونسل کی بنیاد پر بھید بھاؤ کی بات نہیں کرتا۔ ایک غلط فہمی بعض لوگوں کو ہے اسکا ازالہ ضروری ہے کہ مذہب اسلام صرف مسلمانوں سے برادرانہ رشتے کا درس دیتا ہے۔ رسول محترم ﷺ کی مبارک زندگی میں ایک دو نہیں ایسی سینکڑوں مثالیں مل جاتی ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام انسانیت کی بنیاد پر عالمی بھائی چارے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ایک ماں، باپ کی اولاد بتاتا ہے۔ اگر اللہ کے رسول غیر مسلموں سے دور رہتے یا ان سے نفرت کرتے تو ان تک اسلام کا پیغام کیونکر پہنچتا؟ انھیں ایک معبود کی عبادت کی دعوت کیونکر دیتے؟ بلکہ کئی غیر مسلم قبیلوں کے ساتھ آپ نے معاہدے بھی کیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بھارت، انڈونیشیا، ملیشیا اور سری لنکا جیسے کئی ملکوں میں اسلام کا پیغام عرب تاجروں کے ذریعے ہی پہنچا اور غیر مسلموں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے ہی اسکی اشاعت ہوئی۔

حضرات صوفیہ نے رسول پاک ﷺ کے طریقوں کو ہی مشعل راہ بنایا اور سماج کے ہر حصے

میں محبت اور بھائی چارے کے پیغام (MESSAGES) کو عام کرنے کی کامیاب کوشش کی۔
بھارت میں اگرچہ اسلام کی ابتدا عرب تاجروں اور سوداگروں کے ذریعے ہوئی مگر پورے ملک میں اسے پھیلانے کا کام صوفیہ نے ہی کیا۔ یہ کام غیر مسلموں سے میل جول اور حسنِ سلوک کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ صوفیہ کی حیثیت ایک داعی کی رہی ہے لہٰذا انکے لئے دوسرے مذاہب کے لوگوں سے نفرت کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ ابھی چند صفحات قبل گزرا کہ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے یہودی پڑوسی کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اس قسم کے بیشمار واقعات صوفیہ کے تذکروں میں ملتے ہیں۔ ایک اور تاریخی سچائی ہے کہ صوفیہ کی پہلی خانقاہ کی تعمیر بھی ایک غیر مسلم کی مدد سے ہوئی۔ شیخ ابو ہاشم صوفی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ پہلی صدی ہجری کے صوفی ہیں اور پہلے ایسے صوفی ہیں جس نے صوفی کا لقب اختیار کیا۔ آپ نے ہی رملہ (شام) میں پہلی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اسکی تعمیر میں ایک پارسی کی مدد شامل تھی۔ اسکی تفصیل علامہ عبدالرحمٰن جامی کی کتاب نفحات الانس میں یوں ہے:

> ''ایک دن ایک امیر جو آتش پرست تھا شکار کے لئے (شہر سے) باہر گیا ہوا تھا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ دو شخص ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور اسی جگہ بیٹھ گئے اور جو کچھ زادِ راہ از قسم آذوقہ ان کے پاس موجود تھا وہ انھوں نے نکالا اور باہم کھانے لگے۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہ پھر اپنے اپنے راستے پر روانہ ہوگئے۔ امیر کو ان کا یہ باہمی خلوص اور دوستانہ رویہ بہت پسند آیا۔ اس نے ان میں سے ایک مسافر سے دریافت کیا کہ تمہارا وہ دوسرا ساتھی کون ہے؟ اس نے کہا مجھے نہیں معلوم! کیا تمہیں اس سے کوئی کام تھا؟ امیر نے کہا کہ نہیں، میں نے یونہی دریافت کیا۔ پھر امیر نے پوچھا کہ وہ کدھر سے آرہا تھا، اس نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم! امیر نے کہا کہ پھر تمہارے درمیان یہ محبت وخلوص کیسا؟ اس مسافر درویش نے کہا کہ ہم لوگوں کی روش اور طریقہ یہی ہے۔ امیر نے دریافت کیا کہ تمہارا کہیں کوئی ٹھکانہ بھی ہے، جہاں تم لوگ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہو؟ درویش نے جواب دیا کہ ہمارے پاس ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ امیر نے کہا میں تمہارے لئے ایک مکان تعمیر کرائے دیتا ہوں، جہاں تم سب لوگ جمع ہوسکو۔ اسکے بعد اس امیر نے ایک مکان (خانقاہ) شہر رملہ میں تعمیر کرادیا۔'' (صفحہ ۱۷۷)

حضرت احمد بن حرب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک واقعہ تذکرۃ الاولیاء میں ملتا ہے کہ انکے

پڑوس میں ایک پارسی رہتا تھا جس کا نام بہرام تھا۔ایک بار بہرام کا مالِ تجارت ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تو حضرت احمد بن حرب اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کی دلجوئی کے لئے گئے۔بہرام آپ کی آمد سے بہت خوش ہوا اور آپکی باتیں سن کر کہنے لگا کہ اس معاملے میں تین شکر کرتا ہوں ایک تو اس بات کا کہ ڈاکو میرا مال لوٹ کر لے گئے لیکن میں نے کسی کا مال نہیں لوٹا۔دوسرے اس بات کا کہ وہ آدھا مال لے گئے اور آدھا باقی ہے۔تیسرے اس بات کا کہ وہ دنیا لوٹ کر لے گئے مگر میرا دین محفوظ ہے۔حضرت احمد بن حرب نے اس کی معقول باتیں سن کر اپنے دوستوں سے فرمایا کہ اس بات کو لکھ لو مجھے بہرام سے آشنائی کی بو آتی ہے۔پھر کچھ سوال و جواب کے بعد بہرام کے ایمان لانے کی بات درج ہے۔

عام طور پر اسلام مخالفوں نے اسلام کو ایک غیر مسلم مخالف مذہب کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایسا مذہب جو دوسرے مذاہب کو برداشت کرنے کو تیار نہیں، مگر یہ بات سچائی کے خلاف ہے۔ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ،،دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں،،اسی طرح اسلامی ریاست میں انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے اور انکی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔اس سلسلے میں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ لائق عبرت ہے۔اسے معروف صوفی اور عالم دین امام محمد غزالی نے مکاشفۃ القلوب میں درج کیا ہے:

> ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے ذمی (غیر مسلم) کو لوگوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے دیکھا تو فرمایا، ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔جوانی میں تجھ سے جزیہ (ٹیکس) لیتے رہے اور بڑھاپے میں تجھے دربدر ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا۔آپ نے اسی وقت اس کا بیت المال (PUBLIC EXCHEQUER) سے وظیفہ مقرر کر دیا۔''(باب۔۱۸)

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کے تعلق سے کچھ حقوق لازم ہیں۔اسی طرح ہر مسلمان پر ایک انسان کی حیثیت سے کچھ انسانی حقوق بھی ضروری ہیں۔اسے تمام انسانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا چاہئے۔اسے انسان،انسان میں فرق نہیں کرنا چاہئے۔ہر مسلمان پر پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی بھی لازم ہے۔پڑوسی مسلمان ہو یا غیر مسلم،یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام حق ادا کئے جائیں ۔یہاں تک کہ اگر وہ اخلاق سے پیش نہ آتا ہو تو بھی مسلمان پڑوسی پر ضروری ہے کہ وہ اس کے حق

ادا کرے۔ کیونکہ پڑوسی کے حقوق کی ادائیگی مسلمان پر ضروری ہے نہ کہ غیر مسلم پر۔ اگر اس کے حقوق ادا نہیں کیے تو اللہ کی بارگاہ میں بندوں کے حق نہ ادا کرنے کے سبب جوابدہ ہونا پڑے گا۔

• بھارت کے مسلمانوں کو ہمیشہ حکومت اور اپنے ہم وطن بھائیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ انکے ساتھ بھید بھاؤ کا برتاؤ کیا جاتا ہے اور انکے جائز حقوق انھیں نہیں دیئے جاتے۔ سرکار بنانے سے لے کر سرکاری نوکریوں تک میں ان کی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی پارٹیاں ان کے نام پر سیاست کرتی ہیں اور فرقہ وارانہ فسادات کرا کرا نکی نسل کشی کی جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر مسلمان یکطرفہ طور پر صوفیہ کے طریقے پر عمل شروع کر دیں تو بہت حد تک ان حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ نفرت کے جواب میں محبت کا برتاؤ ہمیشہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اس طریقے سے بڑے بڑے پتھروں کو موم کیا جاسکتا ہے۔

انسان محبت کا خوگر ہے

آدمی کو اس کے پیدا کرنے والے نے محبت کا خوگر بنایا ہے۔ وہ محبت کرتا ہے اور محبت کیے جانے کی توقع رکھتا ہے۔ کئی وقتی مسائل اسے ایک دوسرے سے دور کر دیتے ہیں مگر پھر جب اسکی نگاہوں کے سامنے سے نفرت کا مصنوعی پردہ ہٹتا ہے تو سچائی بے پردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نفرت کے کہرے سے نکل کر محبت کی روشنی میں آجاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک تمثیلی واقعہ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک گاؤں میں دو الگ الگ مسلک کے مدرسے تھے ۔ دونوں کی آپس میں چپقلش رہتی تھی۔ ان کے ذمے داران اور مدرسین کبھی ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے چہ جائیکہ ایک دوسرے کے ساتھ سلام، دعاء کریں۔ اس قسم کی نفرت بہت عام ہے اگر آپ کے گاؤں یا شہر میں دو الگ الگ مکاتب فکر کے مدرسے ہوں تو اس قسم کی نفرت اور بیزاری کا احساس آپ بھی کر سکتے ہیں۔ امریکہ اور ایران کے درمیان صلح ممکن ہے، نارتھ کوریا اور ساؤتھ کوریا کی دشمنی ختم ہو سکتی ہے مگر اہل مدارس کے بیچ نفرت کا ختم ہونا ایک ناممکن سی بات ہے۔ ابھی اتنے اچھے دن نہیں آئے کہ اہل مدارس آپس میں محبت اور اخوت کا برتاؤ کریں۔ یہ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی لڑائی نہیں جو ختم ہو جائے یہ مسلکی لڑائی کفر و ایمان سے آگے کی لڑائی ہے۔ اس لڑائی کو بھی ایک تقدس کا مقام حاصل ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ جب

تک یہ اہل مدارس جھگڑا کراتے رہیں تب تک یہ مذہبی کیسے ہوسکتے ہیں؟ کیا کوئی مذہب بھی آپس میں جھگڑا کرنا سکھاتا ہے؟ کیا کوئی دھرم نفرت کی تعلیم دیتا ہے؟ اگر دیتا ہے تو وہ مذہب کب رہا؟ اسے دین ودھرم کیسے کہا جاسکتا ہے؟

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں ، بیر رکھنا

بہر حال ان دونوں مدرسوں کے درمیان لڑائی رہتی تھی۔ کئی بار مناظرے بھی ہو چکے تھے جو بغیر کسی انجام کے ختم ہوئے تھے۔ طلباء بھی ایک دوسرے سے دور دور رہتے تھے، انھیں اسی کی تعلیم بھی دی گئی تھی۔ ایک دن اتفاق سے ایک مدرسے کا ایک طالب علم دوسرے مدرسے کے ایک طالب علم سے مل گیا۔ اس نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ دوسرے نے جواب دیا، جہاں ہوا لے جائے۔ پہلے طالبعلم نے اپنی اس ملاقات کی روداد اپنے استاد کو بھی سنادی۔ استاد نے اس بات کا اسے فوراً جواب بھی بتادیا۔ کیونکہ وہ اس لڑائی میں اپنے گروپ کو پیچھے نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے کہا اب جب وہ طالب علم ملے تو کہنا کہ اگر ہوا بند ہوگئی تو کہاں جاؤ گے؟ استاد کا جواب، بلکہ ایسا جواب جس میں ایک سوال بھی پوشیدہ تھا، اب طالبعلم کے پاس تھا۔ اب اسے اس دوسرے مدرسے کے طالبعلم سے ملاقات کا انتظار تھا۔ اتفاق سے ایک دن یہ ملاقات ہو بھی گئی۔ اس نے پوچھا کہاں جارہے ہو؟ اس لئے نہیں کہ وہ جاننا چاہتا تھا، بلکہ اس لئے کہ اس کے پاس جواب تیار تھا، مگر اکثر تیار جواب بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک دو دن قبل کا تیار کھانا باسی ہوجاتا ہے اور کھانے کے لائق نہیں رہتا اسی طرح دو چار دن پہلے کا تیار جواب بھی اکثر بیکار ہوجاتا ہے ۔جواب میں پہلے مدرسے کے طالب علم نے کہا کہ جہاں قدم لے جائیں۔ اب تیار شدہ جواب بیکار ہو چکا تھا۔ طالبعلم واپس اپنے استاد کے پاس آیا اور پورا ماجرہ کہہ سنایا۔ استاد نے کہا، اسی لئے تو ہماری ان سے دشمنی ہے کہ دوسرے مدرسے والے اپنی بات پر قائم نہیں رہتے، زبان کے پکے نہیں، ورنہ ہمارا آخران سے اختلاف کیا ہے؟ بہر حال ہم ان سے ہار ماننے والے نہیں۔ میں تمہیں جواب بتاتا ہوں، اب جب وہ طالب علم ملے تو تم کہنا، اگر خدانخواستہ پاؤں ٹوٹ گئے تو کہاں جاؤ گے؟ طالبعلم کے پاس جواب تیار تھا، وہ اس وقت کے انتظار میں تھا جب دوسرے مدرسے کا طالبعلم ملے اور وہ اسے جواب دے۔ آخر کار وہ وقت بھی آیا جب دونوں کی راستے میں ملاقات ہوگئی۔ تیار شدہ جواب دہرانے کی چاہت میں اس نے پوچھا، کہاں جارہے ہو؟ دوسرا طالبعلم

بولا، بازار سبزی لانے جارہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر تیار شدہ جواب بیکار کر دیا تھا۔

اس پورے تمثیلی واقعے کو بیان کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ انسانی سماج میں نفرت پھیلانے کی اس قسم کی کوششیں اکثر ہوتی رہتی ہیں مگر نفرت تو نفرت ہی ہے اسکی عمر لمبی نہیں ہوتی۔ اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی تو محبت ہی ہے۔ ممکن ہے سیاستدانوں کے گمراہ کن بیانات اور عوام کو مذہب، ذات، زبان اور نسل میں بانٹنے کی کوششیں وقتی طور پر کام کر جائیں مگر آخر میں حاوی محبت ہی ہوتی ہے۔ آدمی کے خمیر میں سب سے زیادہ تناسب محبت کا ہی ہے لہٰذا محبت ہی انجام کار سرخرو ہوتی ہے۔

نفرت کا علاج

نفرت ہمارے سماج کا ناسور ہے۔ یہ انسانی معاشرے میں مختلف سطح پر پھیلا ہوا ہے اور اسکا صرف ایک علاج ہے کہ نفرت کے جواب میں محبت کو عام کیا جائے۔ نفرت کا جواب محبت سے دیا جائے۔ نفرت کرنے والوں سے نفرت ویسا ہی ہے کہ اگر کتے نے آدمی کو کاٹا تو آدمی بھی کتے کو کاٹ لے۔ جس طرح یہ غیر مناسب عمل ہے اسی طرح نفرت کا جواب نفرت سے دینا بھی غیر مناسب ہے۔ اگر نفرت کے جواب میں ویسا ہی برتاؤ کیا جائے تو پھر اس کا سلسلہ چل پڑیگا اور ہمارا معاشرہ نفرت سے بھر جائیگا۔ ہر طرف نفرت ہی نفرت ہوگی۔ یہ دنیا انسان کے رہنے لائق نہیں رہ جائیگی۔ جہاں ہر طرف نفرت کی حکمرانی ہوگی وہاں انسان کیسے رہ پائیگا؟ لہٰذا نفرت کے جواب میں محبت کا اظہار ہی اس کا بہترین حل ہے۔ اہل تصوف کی کامیابی اور تصوف کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب اسی میں پنہاں ہے اور یہ عین طریقۂ رسول کے مطابق ہے۔ آج سماج میں نفرت بڑھ رہی ہے۔ مذہب، ذات، رنگ ونسل اور علاقائیت کے نام پر نفرت وتعصب عام ہے۔ تصوف اس کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔ تمام انسان بہ حیثیت انسان برابر ہیں، کوئی پیدائش سے چھوٹا بڑا نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں۔ خواہ کسی بھی رنگ ونسل اور کسی بھی علاقے سے تعلق رکھنے والا انسان ہو وہ ہمارے لئے قابلِ احترام ہے کیونکہ وہ خالقِ کائنات کی صفتِ تخلیق کا مظہر ہے۔ ہر آدمی آدم کی اولاد ہے اور اس لحاظ سے سبھی مساوی ہیں۔ فارسی کے مشہور شاعر اور صوفی شیخ سعدی کہتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یک دیگرند
کہ در آفرینش زیک جوہرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار
دیگر عضوہا را نماند قرار

یعنی آدم کی اولاد ایک بدن کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں، کہ سبھی اپنی پیدائش میں ایک جوہر سے ہیں۔ جب جسم کے ایک عضو کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو دوسرا عضو بھی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ سعدی کا یہ قول انسانیت کی بنیاد ہے اور تصوف کے مزاج کا اظہار ہے۔ یہی خیال تقریبا تمام صوفیہ کے ہاں الفاظ کے ہیر پھیر کے ساتھ ملتا ہے۔ آج اگر اس خیال کو کتاب سے باہر نکالا جائے اور زندگی کا حصہ بنایا جائے، عملی طور پر اسے لاگو کیا جائے تو دنیا سے نفرت کا وجود مٹ سکتا ہے۔ انسان انسان کا بھائی بن کر رہ سکتا ہے۔ اخوت ومحبت کا ماحول قائم ہو سکتا ہے اور امن وامان کی فضا اس خاکدانِ عالم کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔

(غوث سیوانی، جدید دنیا کے مسائل اور تصوف، صفحہ ۲۱ تا ۲۴)

چودہواں باب

تصوف کی نظر میں علم کا مطلب

عہدِ حاضر میں تعلیم کا مطلب

اس وقت جن علوم وفنون کا دنیا میں رواج ہے وہ وہی ہیں جو مادہ پرستی سے عبارت ہیں۔ جو انسان کو دنیا کی دولت سے مالا مال کرنے والے ہیں، جن کی ڈیمانڈ بڑی بڑی کمپنیوں کو ہے اور جو ہماری زندگی کو دنیاوی جاہ وحشمت سے ہمکنار کرنے والے ہیں۔ اخلاقی علوم چونکہ دنیا کی دولت نہیں دیتے لہٰذا انکی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ موجودہ دور میں صرف انھیں لوگوں کو پڑھا لکھا اور کامیاب سمجھا جاتا ہے جو اپنے چھل بل کی بنیاد پر مالی منافع کمانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آدمی دولت کمانے کی مشین بن چکا ہے اور اخلاقیات سے عاری ہوتا جارہا ہے۔

پڑھے لکھے جاہل

آخرایسا کیوں ہورہا ہے کہ جو تخریبی کام کل تک جاہل اور غیر مہذب لوگ کرتے تھے آج وہی کام تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے افراد کررہے ہیں؟ ظاہر ہے اس علم میں کچھ کمی ہے، یہ تعلیم نامکمل ہے اور اس کے حصول کے اغراض ومقاصد درست نہیں ہیں۔ ورنہ جو علم انسانی زندگی کے فروغ

وبقا کے لئے استعمال ہونا چاہئے تھا وہ اسکی تباہی کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ آخر اس علم کو علم کیسے تسلیم کیا جائے جو آدمی کو فلاح وصلاح کے بجائے تباہی کی طرف لے جائے؟

علم کا یہ استعمال

آج علم کے حصول کا مقصد ہی واضح نہیں ہے تو پھر اس کا استعمال کہیں بھی ہوسکتا ہے۔ جب ہمارا ہر کام دولت کے لئے ہوتا ہے تو علم کا استعمال بھی اسی کام کے لئے ہوگا۔ اگر دولت کی فراہمی کسی کی جان لے کر ہوتی ہے تو انسان، انسان کا قتل کریگا۔ اگر آبادیوں پر ایٹم بم گرا کر اسے تمغہ حاصل ہوتا ہے تو وہ یہ بھی کریگا۔ اگر شہروں کو ویران کر کے اسے دنیاوی جاہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اسکے لئے بھی تیار ہے۔ آج انسان چاند پر ضرور پہونچ چکا ہے، مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے، دوسری دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اسی زمین پر بسنے والوں کے مقام ومرتبے سے ناواقف ہے، انسانی جانوں کا احترام بھی نہیں سیکھ پایا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا مقصد وجود کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں کس کام کے لئے بھیجا گیا ہے؟ وہ دنیا کی ہر چیز کا مقصدِ وجود سمجھتا ہے مگر اپنے وجود کا مقصد نہیں جانتا۔

تصوف کی نظر میں علم کا مطلب

صوفیہ کی نظر میں وہی علم، علم ہے جو انسان کو خالق کی معرفت تک پہونچائے۔ جس سے اپنے مالک کا عرفان حاصل ہو۔ وہ علم سرے سے علم ہی نہیں بلکہ جہل سے بدتر ہے جسکی بنیاد تعمیر کے بجائے تخریب پر رکھی گئی ہو۔ جو آبادیوں کو ویران اور شہروں کو مسمار کرے وہ سائنس نہیں، تخریب سائنس ہے۔ ابوعلی ثقفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

"جہالت اور تاریکی کے مقابلے میں علم دل کی زندگی اور آنکھوں کا نور ہے"۔

(کشف المحجوب، صفحہ ۴۶)

احمد بن عاصم انطاکی علیہ الرحمہ جو کہ بشر حافی، سری سقطی اور حارث محاسبی کے ہمعصروں میں ہیں فرماتے ہیں:

"ہر عمل کا رہنما علم ہے اور علم کی پیشوا عنایت ہے۔" (نفحات الانس، صفحہ ۲۲۰)

بابا فرید گنج شکر فرماتے ہیں:

''اگر لوگوں کو علم کا درجہ معلوم ہو جائے تو تمام کام چھوڑ کر علم حاصل کرنے میں لگ جائیں۔ اس لئے کہ علم ایک ایسا بادل ہے جو رحمت کی برکھا کے سوا نہیں برستا جو اس بادل کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور شیخ جلال الدین تبریزی ایک ہی جگہ تھے، فرمایا کہ علم ایک چراغ ہے جس سے عالم ناسوت اور عالم ملکوت روشن ہیں، جو شخص علم میں مشغول ہے اسے تاریکی کا کیا ڈر ہے؟ کیونکہ اس کے جسم میں تمام جہان روشن ہے''۔ (راحت القلوب، مجلس ۱۴)

نفحات الانس میں علامہ عبدالرحمٰن جامی نے شیخ محمد بن منصور طوسی کا قول نقل کیا ہے، عبارت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''مسافر کو اپنے سفر میں ان چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو علم، جو اسے وسوسے میں نہ ڈالے، دوم ذکر جو اس کا غمخوار ہو، سوم پرہیزگاری جو برے کاموں سے روکے، چہارم یقین جو اسے اٹھائے پھرے۔۔۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ ساری عمر، ان چار چیزوں کے بغیر بسر نہیں ہوتی کیونکہ تو ہمیشہ سفر میں ہے اور ایک منزل کی طرف تو متوجہ ہے، جو شخص ان چار چیزوں سے خالی ہے وہ برباد اور تباہ ہے یعنی ایک تو علم جو اس کا تابع ہو اس کو درست اور شاد رکھے۔ دوسرے ذکر جو اس کا مونس ہو اور تنہائی میں اس کو وحشت سے بچائے، تیسرے پرہیزگاری جو اس کو برے کاموں سے روکے، چوتھے یقین، جو اس کی سواری ہو، تاکہ وہ پیچھے نہ رہ جائے۔ اس وقت وہ جس شغل میں بھی مشغول ہوگا اس کی زندگی تلخ نہ ہوگی۔'' (صفحہ ۲۲۱)

حضرت محمد بن فضل علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''علوم تین طرح کے ہیں (۱) علم، جو اللہ کی طرف سے ہو۔ (۲) علم، جو اللہ کیساتھ ہو۔ (۳) علم جو اللہ کے لئے ہو۔ اسی کو علم معرفت کہتے ہیں۔ کیونکہ تمام انبیاء اور اولیاء نے اسی سے اللہ کی معرفت پائی ہے۔ جب تک انھیں اسکی معرفت نہ ہوئی منزل عرفان حاصل نہ ہوئی۔ اسلئے محض محنت وکوشش کے ذریعے حصول معرفت وذات حق کے عرفان کے لئے منقطع ہے۔ کیونکہ بندہ کا علم، معرفتِ حق کی علت نہیں بن سکتا۔ درحقیقت

معرفتِ الٰہی کی علت، اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت اور اسکی عنایت ہے۔"

(کشف المحجوب، صفحہ ۵۴-۴۶)

برصغیر میں ابتدائی دور کے صوفی حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر اس پر روشنی ڈالی، تو یہ حجاب اس جہان میں اس کے لئے اختیار طبع بن گئی کیونکہ اس نے اپنی طبیعت اور اپنی عقل سے اس میں تصرف کیا۔ حتیٰ کہ اس نے نہ صرف جہل ونادانی کو پسند کیا بلکہ ان حجابات کا وہ دل وجان سے خریدار ومتوالا بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمالِ کشف سے بے خبر اور اسرارِ الٰہی کی تحقیق سے بے پرواہ بن گیا، اور وہ عارضی مسکن میں خوش رہ کر اپنی فلاح ونجات سے غافل ہو گیا۔ اس طرح وہ توحید باری سے بے علم، جمالِ احدیت سے بے خبر اور ذائقۂ توحید سے نا آشنا ہو گیا ہے۔ روح وجسم کے ترکب سے مشاہدہ حق کی تحقیق سے محروم ہے اور دنیاوی حرص وطمع میں مبتلا ہو کر حق کی طرف رجوع وانابت سے بے بہرہ ہو گیا اور نفسِ حیوانی نے جو حیاتِ حقیقی کے سوا ہے، اسکے ناطقہ کو مجبور کر دیا یہاں تک تمام حرکات وخواہشات، نفسِ حیوانی کے تابع ہو کر رہ گئیں۔ پھر یہ حالت ہو گئی کہ سوائے کھانے، پینے، سونے اور شہوانی خواہشات کے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اولیاء کو ان تمام باتوں سے بچنے کا حکم فرمایا۔"

(کشف المحجوب، صفحہ ۳۵)

سہل بن عبداللہ تستری علیہ الرحمہ سے لوگوں نے پوچھا کہ بدنصیبی اور بدبختی کی علامت کیا ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ:

"خدا تجھے علم عطا کرے اور عمل کی توفیق نہ دے، عمل دے تو اخلاص نہ دے اور جو عمل کرے وہ بیکار ورائیگاں جائے، نیکوں کی صحبت اور زیارت کا تجھے موقع بخشے لیکن ان میں مقبولیت نہ ہو۔" (نفحات الانس صفحہ ۲۲۶)

بابا فرید گنج شکر نے فرمایا:

"حدیث میں آیا ہے کہ بلاشبہ عقل اور علم ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ عقل کے لئے علم

ضروری ہے اور علم کے لئے عقل۔ تو آدمیوں میں سب سے اچھا وہی ہے جو اپنے آپ کو پہچانے۔ اس صورت میں عقل اختیار والی ہے۔ پھر فرمایا کہ 'تواریخ' میں قاضی حمید الدین ناگوری لکھتے ہیں کہ ہر چیز کی انتہا ہے اور عبادت کی انتہا عقل ہے اس لئے کہ بغیر علم کے عبادت کرنا فضول اور تکلیف دہ ہے اور علم بغیر عقل کے مفت کی سردردی ہے۔ قیامت کے دن دلیل یہی عقل ہے۔" (راحت القلوب، مجلس۔۱۳)

شیخ ابراہیم بن شیبان کرمان شاہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"میرے والد محترم نے مجھے وصیت کی تھی کہ علم کو آداب ظاہری کے لئے سیکھو اور تقویٰ آداب باطن کے لئے اختیار کرو، اس چیز سے دور رہو جو چیز تمہیں خدا سے روک دے۔"

(نفحات الانس، صفحہ ۴۳۴)

حضرت شیخ ابراہیم مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

"کان جو کچھ معلوم کرتا ہے وہ علم ہے اور جو کچھ فہم معلوم کرتا ہے وہ حکمت ہے، اور جو کچھ فہم سے سنے اور اسی سے دریافت کرے وہ زندگی ہے۔" (نفحات الانس، صفحہ ۴۳۷)

بُرے علماء

تصوف کی نظر میں علم کا مقصد دنیا کی دولتیں کمانا نہیں بلکہ اپنے پیدا کرنے والے کو پہچاننا اور اس سے دنیا کا بھلا کرنا ہے۔ علم والا اگر اپنے مقصد سے بھٹک جائے تو اسے برا عالم کہا جاتا ہے۔ بابا فرید گنج شکر فرماتے ہیں:

"علماء کے متعلق لکھا ہے کہ حشر کے دن ان علماء کے لئے جو دنیا بنانے میں لگے ہوئے تھے حکم ہوگا کہ ان کے گلوں میں آگ کے انگارے پہنا کر ان کو جہنم میں ڈالا جائے۔ پھر فرمایا یہ وہ علماء ہیں جو ظاہر میں پارسائی دکھاتے ہیں لیکن باطن میں ان کا عمل ٹھیک نہیں اور مکر و حیلے سے دنیا کو لوٹتے ہیں۔" (راحت القلوب، مجلس ۱۴)

ایسے علم والوں کے متعلق مشہور صوفی اور سلسلہ نقشبندیہ کے شیخ، حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندی لکھتے ہیں:

"یہ (بڑے علماء) پارس پتھر کی طرح ہیں کہ تانبے اور لوہے کی جو چیز بھی اس کے ساتھ رگڑ کھاتی ہے، سونا ہو جاتی ہے اور وہ خود اپنی ذات میں پتھر ہی رہتا ہے، اور اسی طرح وہ آگ جو پتھر اور بانس میں پوشیدہ موجود ہے، دنیا کو اس آگ سے بہت سے فائدے حاصل ہیں لیکن وہ پتھر اور بانس اپنے اندر کی موجودہ آگ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔" (مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب۔۳۳)

اوپر کے اقتباسات سے حضرات صوفیاء کے خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہ علم کو کھانے کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ معرفت حق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس سے آخرت کی بھلائی چاہتے ہیں۔ علم اخلاق سے عاری ہو جائے تو شتر بے مہار کی طرح ہو جاتا ہے، یا ایسی بندوق کی طرح، جو گولیوں سے بھری ہوئی ہو اور کسی ناسمجھ بچے کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اگر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانے والے سائنسدانوں کو علم کے ساتھ تھوڑی سی اخلاقی سوجھ بوجھ بھی مل جاتی تو ہلاکت خیز سامان بنانے سے پہلے سو بار سوچتے کہ انکی ایجاد کا استعمال کہاں کہاں ہو سکتا ہے۔ سائنس اور تیکنالوجی انسانیت کی بھلائی اور اسکی بہتری کے لئے ہے نہ کہ اسکے خاتمے کے لئے۔ علم کا مقصد تعمیر ہے نہ کہ تخریب۔ وہ علم، علم نہیں جو آدمی کو تعمیر کے بجائے تخریب پر اکسائے۔

صوفیہ کا صنعتی انقلاب

صوفیہ کی نظر میں علم انسانیت کی بھلائی اور اسکی فلاح وصلاح کے لئے ہے۔ اللہ کی معرفت اور اسکی ربوبیت پر غور وفکر کے لئے ہے۔ یقیناً انسانی زندگی کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ اسکے بغیر انسانی زندگی نامکمل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجاد اور اس کا استعمال ہی آدمی کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتا ہے، لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی سائنس کا استعمال تخریبی مقاصد سے ہی کرے؟ تصوف سائنس تیکنالوجی کا مخالف نہیں، مگر اس کا بے جا استعمال کسی طرح پسند نہیں کرتا۔ صوفیہ نے انسانیت کی بھلائی کے لئے ہر اس طریقے کا استعمال کیا، جو ان کے دور میں دستیاب تھا۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر کسی فن پر توجہ ڈالا تو اسکا مقصد بھی تعمیری رہا۔ انھوں نے مختلف قسم کی صنعتوں، حرفتوں اور دستکاریوں میں دلچسپی دکھائی تو انسانیت کی بھلائی کے لئے۔ مثال کے طور پر کشمیر کی تاریخ پر نظر ڈالی جا سکتی ہے، جہاں ایرانی صوفیاء نے صنعت

وحرفت کے میدان میں انقلاب برپا کردیا۔ایسا انقلاب کہ کئی صدیاں بیتنے کے بعد بھی اسکے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔میر سید علی ہمدانی رحمہ اللہ علیہ جنھیں عام طور پرشاہ ہمدان یا امیر کبیر کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے آٹھویں صدی ہجری میں تقریبا سات سو مریدین کے ہمراہ ایران سے کشمیر تشریف لائے۔ان کے ساتھی مختلف علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے کشمیریوں کو ایرانی فنون سکھائے اور آج جو بھی دستکاریاں اور فنون رائج ہیں وہ تمام انھیں صوفیہ کی دین ہیں۔پشمینہ شال،مختلف قسم کی چادریں اور کپڑے،نقاشی اور زردوزی وغیرہ ایرانی صوفیہ کی ہی دین ہیں۔ان صوفیہ نے یہاں ایسا تہذیبی اور صنعتی انقلاب برپا کیا کہ کشمیر کو ایرانِ صغیر کہا جانے لگا۔علامہ اقبال نے''جاوید نامہ''میں اس کا اعتراف یوں کیا ہے:

سید السادات سالارِ عجم　　دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
تا غزالی درسِ اللہ ُگرفت　　ذکرِ او از دودمانِ او گرفت
مرشدِ آن کشورِ مینو نظیر　　میر ودرویش وسلاطیں رامشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں　　داد علم وصنعت وتہذیب ودیں
آفرید آں مرد ایران صغیر　　باہنر ہائی غریب و دل پذیر
یک نگاہ او کشاید گرہ　　خیز وتیرش را بدل راہی بدہ

صوفیہ نے کشمیر میں عوام کو روزگار سے جوڑنے کے لئے جو کام کیا ہے اسکا فیضان آج بھی جاری وساری ہے،بلکہ کشمیر کی پہچان ہی ان دستکاریوں سے ہوتی ہے۔کشمیر کے علاوہ دوسرے کئی علاقوں میں بھی صوفیہ نے عوام الناس کی بھلائی کے لئے تعمیری اقدام کئے ہیں،جو دنیا کے لئے ایک زرین مثال ہے۔

علم کا مقصد تعمیر یا تخریب؟

علم وفن کا حصول دولت کے لئے نہیں کیا جاتا مگر یہ کئی بار دولت کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے،اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں۔قباحت اس میں ہے کہ آدمی اپنی زندگی کا مقصد ہی دنیا کی دولت کو حاصل کرنا بنالے اور اس کے لئے ہر اچھا برا کام کرنے کو تیار رہے،یہاں تک کہ قتل وغارت گری بھی۔آج دنیا میں علم کے حصول کا مقصد یہی بن گیا ہے۔کیا ایک فوجی یہ جانتا ہے کہ

وہ دوسرے ملک کے فوجی کی جان کیوں لے رہا ہے؟ کیا ایک بمبار فائیٹر کو آپریٹ کرنے والا انجینیر یہ سمجھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ یہ بمباری کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیگی، کتنے انسانوں کو ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے ختم کردیگی؟ کیا ایٹمی ہتھیار بنانے والے اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے ہتھیار ایسی تباہی مچا سکتے ہیں کہ انسانی نسل ہی خاتمے پر پہونچ جائے؟ یقیناً نہیں۔ اور یہ سب اسی تعلیم کا نتیجہ ہے جو اخلاقیات سے عاری ہے۔ جس کا مقصد انسانیت کی فلاح و بہبود نہیں بلکہ دنیا کی دولت کمانا ہے، ساری کائنات پر اپنا دبدبہ قائم کرنا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ وہ تعلیم کس کام کی جسکا بنیادی مقصد ہی فرعونیت، نمرودیت، شدادیت اور قارونیت ہو؟ وہ علم کس کام کا، جو انسان کو فلاح کے بجائے تباہی، بربادی کی سوغات دے؟

تعلیم بھلائی کے لئے

تصوف کی بنیادی خوبی یہی ہے کہ وہ انسان کو ایک مقصدِ زندگی دیتا ہے۔ علم کا حصول وہاں بھی لازم ہے مگر اسکا مقصد خیر و صلاح ہے نہ کہ سماج اور انسانیت کی بربادی۔ وہ پیسہ کمانے اور روزگار کے حصول سے نہیں روکتا مگر وہ اسکی بھی اجازت نہیں دیتا کہ آپ اسکے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے کو اپنا لیں۔ تصوف انسان کو اخلاقی ضابطوں کے ساتھ زندگی جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ساری دنیا سے بے نیاز کر کے ایک مالک کا نیازمند بناتا ہے۔ تصوف انسان کے اندر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے جوابدہ ہونے کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اگر تصوف کو نصابِ تعلیم کا حصہ بنا دیا جائے تو یہ طلباء کے اندر حیرت انگیز تبدیلی لا سکتا ہے۔

بچے کورے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں ان پر جو رنگ چاہو چڑھا دو۔ موجودہ دور میں ہماری تعلیم کا ڈھانچہ مغرب کی نقل ہے۔ اہل مغرب کا بڑا طبقہ مادہ پرست ہے، انکے تعلیمی ماہرین بھی اسی انداز میں سوچتے ہیں لہٰذا وہ اپنے ملک کے لئے تعلیمی ڈھانچہ بھی اسی قسم کا تیار کرتے ہیں۔ جب مغرب اخلاقیات سے عاری ہو رہا ہے تو مشرق بھی دیکھا دیکھی اسی راستے پر چل رہا ہے۔ جب مغرب نے اپنے لئے مادہ پرستانہ طریقہ چنا تو مشرق کو بھی اسی میں بھلائی نظر آنے لگی۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ بھیڑ چال کتنی نقصاندہ ہو سکتی ہے۔

مشرق روحانیت کا گھوارہ

مشرقی ممالک ہمیشہ سے روحانی اور اخلاقی علوم کا مرکز رہے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے روحانی پیشوا پیدا ہوتے رہے ہیں اور عوام وخواص ان سے علمی اور اخلاقی رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ مشرق کے لئے زیادہ آسان ہے اس راستے پر چلنا، مگر اس وقت ہمارے ذہنوں پر مغربی افکار سے مرعوبیت کے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ ہم اس پہلو پر سوچتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ تصوف اک گئے دور کی کہانی ہے یا آج اس کی اہمیت محض اتنی ہے کہ ہم سکونِ قلب کے لئے تھوڑی دیر مراقبہ کرلیں اور ذہنی تسکین حاصل کرلیں، حالانکہ یہ وہ علم ہے جو سماج کو بدلنے کی زبردست طاقت رکھتا ہے اور اس نے اپنی اس صلاحیت کا اظہار مختلف مواقع پر کیا ہے۔ کشمیر میں سماجی، مذہبی، تمدنی اور صنعتی ہی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہتی انقلاب برپا کرنے کا سہرا بھی اسے ہی جاتا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری سے قبل یہ ایک ہندو اور بودھ اکثریتی علاقہ تھا۔ اکا دکا مسلمانوں کے یہاں ہونے کے شواہد ملتے ہیں مگر اسی دور میں یہاں کے بدھسٹ راجہ نے ایک صوفی حضرت عبدالرحمن عرف بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا اور انکے انتقال کے بعد شاہ ہمدان سید علی ہمدانی نے وادی میں ایک ایسا تبلیغی سلسلہ شروع کیا جو بعد میں بھی جاری رہا اور اسکے ذریعے نہ صرف عوام کی اصلاح ہوئی بلکہ یہ صوفیاء کرام بادشاہوں کی بھی رہنمائی کرتے رہتے تھے۔ اسکا یہ اثر ہوا کہ سماج میں ہر طرف خیر وصلاح کا چرچا ہونے لگا اور روحانیت کی فضا قائم ہوگئی۔ اس ماحول نے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں غیر مسلموں کو بھی بدلا۔ ان کے اندر علمی بیداری پیدا ہوئی، شعر وسخن کا ذوق پیدا ہوا اور وہ کشمیر سے لے کر دلی دربار تک چھا گئے۔ یہاں تک کہ مغل حکمراں شاہجہاں کا وزیرِ اعظم چندر بھان برہمن، ایک کشمیری پنڈت تھا۔ یہی شہزادہ داراشکوہ کا اتالیق بھی تھا اور اسی کی تربیت نے دارا کے مزاج میں تصوف کے عناصر شامل کئے تھے۔ برہمن اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اور فارسی کا پہلا صاحب دیوان ہندو شاعر ہے۔

مولانا جلال الدین رومی ایک معروف ترین صوفی ہیں۔ انھیں مشرق سے زیادہ مغرب میں پہچاننے کی کوشش کی گئی۔ رومی کی آخری وصیت ہے:

"میں تم سب کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ ظاہر و باطن میں خداوند تعالی سے ڈرتے رہو، کم کھاؤ، کم سوؤ، کم [illegible] کرو، گناہوں اور معاصی کو ترک کرو، ہمیشہ روزے رکھا کرو، ہمیشہ

رات کو عبادت کرو، ہمیشہ کے لئے خواہشات کو ترک کردو، لوگوں کا ظلم برداشت کرتے رہو، کمینوں اور عام لوگوں کی ہم نشینی کو ترک کردو، نیکوں اور بزرگوں سے صحبت رکھو۔ لوگوں میں بہتر وہ شخص ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے اور نپی تلی بات بہتر ہے۔“

(نفحات الانس، صفحہ ۲۰۷)

اگر آپ نے اوپر کی عبارت کو سرسری طور پر پڑھا ہو تو دوبارہ غور سے پڑھ لیں۔ چند جملوں میں پوری زندگی کی بہتری کا سبق مل جائیگا۔ کیا ان چند نصیحتوں پر عمل کرنے والا کبھی زندگی کے مقصد کو بھول سکتا ہے۔ اوپر درج چند جملے اگر عملی طور پر زندگی میں شامل ہو جائیں تو انسان کی زندگی کا رخ بدل سکتا ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو طلباء کے کردار کو بہتر بنانے میں انقلابی رول نبھا سکتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ماضی میں تصوف نے جو تاریخی کردار اخلاق و کردار سازی میں ادا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور اسکی بنیاد پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آج کے اس خیر و صلاح سے عاری ماحول میں اس کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔

تصوف، نصاب تعلیم میں، ہزار سال تک

تفسیر، حدیث اور فقہ کی طرح علم تصوف بھی اسلامی علوم کا ایک شعبہ ہے اور دوسرے علوم کی طرح اسکی تدوین بھی بنو امیہ کے عہد میں ہوئی۔ حالانکہ صحابہ کے اندر بھی ایک جماعت ایسی تھی جنھیں صوفیہ اپنا پیشوا مانتے ہیں اور سلاسلِ طریقت کی ابتدا بھی خلیفۂ اول ابوبکر صدیق و خلیفۂ چہارم حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مانتے ہیں۔ صوفیہ کی نظر میں خلفاءِ راشدین کے ساتھ ساتھ تمام اصحابِ صفہ بھی صوفی تھے۔ تابعین میں بھی کچھ حضرات تھے جن میں سب سے اہم نام حضرت اویسِ قرنی اور حسن بصری رحمہما اللہ کے لئے جاتے ہیں۔ صوفیہ کا یہ سلسلہ اس دور سے آج تک چلا آرہا ہے مگر جس شخص کو پہلی بار صوفی کے لقب سے پکارا گیا وہ ابوہاشم کوفی تھے۔ انکا دور، پہلی صدی ہجری کا آخری دور تھا۔

تصوف کو ابتدائی دور میں ہی اسلامی ملکوں کے نصابِ تعلیم میں شامل کر لیا گیا تھا اور ایک

ہزار سال سے زیادہ یہ نصاب کا حصہ رہا مگر اس وقت اس موضوع کو نصابِ تعلیم سے تقریباً خارج کر دیا گیا ہے۔ اگر ہندوستان کی سطح پر دیکھیں تو اب انکی تعلیم بالکل نہیں ہوتی۔ صرف ان یونیورسٹیوں میں جہاں اسلامیات (IslamicStudies) کا شعبہ ہے تاریخِ تصوف (HISTORY OF SUFISM) پڑھایا جاتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ یہاں بھی اسلامیات پڑھانے والے بیشتر اساتذہ اسے غیر اسلامی علم قرار دیتے ہیں اور اس کے بدعت ہونے کی بات کہتے ہیں۔ ایسے حالات میں انکی تدریس کتنی مثبت ہوگی یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جب سینکڑوں سال تک یہ نصاب کا حصہ رہا تو کبھی یہ سوال نہیں اٹھایا گیا کہ تصوف بدعت ہے مگر آج اس سوال کو اتنا اچھالا جا رہا ہے کہ اچھے خاصے مسلمان بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں اور وہ غیر مسلم جو تصوف کے مطالعے کی وجہ سے اسلام سے متاثر ہوئے ہیں تذبذب کا شکار ہیں کہ اصل اسلام کون سا ہے؟ خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء اور صوفیاء والا اسلام یا اسامہ بن لادن، ایمن الظواہری، لشکر طیبہ اور القاعدہ والا اسلام؟

نصاب تعلیم سے تصوف کا اخراج

تصوف پر ایک بڑا ستم خود مسلمانوں نے ڈھایا کہ انھوں نے اسے مدرسوں کے نصاب سے نکال باہر کیا۔ دینی مدرسے جنھیں عام مسلمان اسلام کا قلعہ پناہ قرار دیتے ہیں، اب وہاں بھی اسکی پڑھائی نہیں ہوتی، بلکہ ان میں سے بعض مدارس کے نگران خود وہ حضرات ہیں جو صوفیہ کی اولاد ہیں اور انکی اپنی پہچان بھی اسی کی مرہونِ منت ہے۔ انتہا یہ کہ بریلی اور کچھوچھہ جہاں مزارات پر حاضری کے لئے ساری دنیا سے عقیدت مند آتے ہیں، اور یہاں کے پیر صاحبان ساری دنیا میں گھوم گھوم کر تصوف کے موضوع پر تقریریں کرتے ہیں، نیز انکے مریدین لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں، وہاں کے مدرسوں میں بھی تصوف کی پڑھائی نہیں ہوتی۔ دیوبند کی شہرت عظیم الشان دارالعلوم کی وجہ سے پوری دنیا میں ہے، اور اس نظریۂ فکر کے لاکھوں مدرسے ملک اور بیرونِ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں کے بزرگوں میں بیشتر چشتی سلسلے سے وابستہ رہے ہیں اور انھوں نے تصوف کے موضوع پر کتابیں بھی تحریر کی ہیں مگر اس مسلک کے کسی بھی مدرسے میں اب تصوف کی تدریس نہیں ہوتی۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں مدرسوں کے طلباء دورانِ تعلیم اس بات سے مطلقاً بے خبر رہتے ہیں کہ تصوف جیسا کوئی علم بھی دنیا میں موجود ہے۔ یہی نہیں ملک

کے بیشتر صوبوں میں مدرسہ بورڈ ہیں، جن کا اپنا نصابِ تعلیم ہے، ان میں بھی تصوف اور تاریخِ تصوف پر کوئی کتاب نہیں ہے۔

جن گروپوں کے علماء اسے بدعت قرار دیتے ہیں ان سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ اپنے اداروں میں اسکی تعلیم دینگے، مگر جو لوگ اسے عین اسلامی علم سمجھتے ہیں اور اسلام کی لگ بھگ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ سے واقف ہیں، پھر خود کو خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیاء اور صوفیہ کا پیروکار بتاتے ہیں ان سے یہ امید بجا ہے کہ وہ اپنے مدرسوں کے نصاب میں اسے شامل کریں گے۔ حالانکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اب تک اسے مدرسوں کے نصاب سے دور کیوں رکھا گیا؟

اہلِ مدارس کا اخلاقی زوال اور اس کا علاج

زہے مسجد و مدرسہ و خانقاہے
کہ آنجا بود قیل وقال محمد

مساجد، دینی مدارس اور خانقاہوں کو مسلمان ہر دور میں احترام کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔ یہ تینوں ادارے ہمیشہ سے اسلام کے فروغ اور اشاعت میں معاون رہے ہیں۔ یہ وہ کارخانے ہیں جہاں شخصیت سازی ہوتی ہے مگر افسوسناک بات یہ ہے کہ اب یہاں بھی کئی قسم کی کمیاں نظر آرہی ہیں۔ حضرت ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:

> ''لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ علماء، امراء اور فقراء۔ جب علماء خراب ہوجاتے ہیں تو خلق کے طاعت واحکام تباہ ہوجاتے ہیں، اور جب امراء خراب ہوجاتے ہیں تو لوگوں کی معیشت تباہ و برباد ہوجاتی ہے اور جب فقراء خراب ہوجاتے ہیں تو لوگوں کے اخلاق برباد ہوجاتے ہیں۔'' (کشف المحجوب، صفحہ ۲۱۵)

اور جہاں سب کے سب خراب ہوجائیں وہاں کیا کیفیت ہوگی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انھیں ٹھیک کرنے والے اداروں کے ذمہ داران خود بگڑتے جارہے ہیں۔ مساجد کی ذمہ داری جاہل اور غیر ذمہ دار لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ خانقاہوں پر وہ قابض ہیں جن کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ پیر صاحبان کو سجادہ نشینی کی جنگ سے فرصت نہیں۔ مدارس دینی تعلیم اور شخصیت سازی کے بجائے مسلکی فتنوں کی آماجگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دیگر اداروں کی طرح

اب مدرسوں کے تعلیم یافتہ افراد میں بھی اخلاقی زوال دیکھنے کو مل رہا ہے۔ انھیں گڑبڑی کے مواقع کم ملتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد او نچے سرکاری عہدوں تک نہیں پہونچ پاتے ہیں لہٰذا وہ گھپلے گھوٹالے بھی کم ہی انجام دیتے ہیں، لیکن وہ یہ کام اپنے دینی مدرسوں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے اداروں میں بھی کر لیتے ہیں۔ ایسے NGO,s کی کمی نہیں جو انھیں علماء کی طرف سے صرف اس لئے چلائے جاتے ہیں کہ عرب ممالک سے زکوٰۃ، خیرات اکٹھی کر کے عیش وعشرت کے محل تعمیر کئے جائیں۔ سماوی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات کے بعد یہ حضرات عرب ملکوں کے دورے پر چندے اکٹھے کرنے چل پڑتے ہیں۔ وہ دینی مدرسے جہاں اسلامی تعلیمات دی جاتی ہیں اور انسانی برابری کا درس دیا جاتا ہے، وہاں طلباء کے ساتھ کئی طرح کی نابرابری بھی دیکھی جاتی ہے۔ بعض اوقات علاقائی، لسانی اور نسلی امتیاز دیکھنے کو ملتا ہے۔ آج کل کئی مدرسوں میں برادری کے نام پر بھید بھاؤ برتا جاتا ہے خاص طور پر صوبہ بہار جہاں اس قسم کا تعصب عام ہے اور اس معاملے میں اسلامی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کئی مدرسے تو برادری کے نام پر ہی وجود میں آئے ہیں۔ راقم الحروف خود ایسے کئی مدارس سے واقف ہے۔ اتر پردیش کے مدرسوں میں بہار اور بنگال کے طلباء کے ساتھ متعصبانہ رویہ عام ہے۔ جہانگیر گنج ضلع فیض آباد کے ایک دینی مدرسے میں بہاری بچوں کے داخلے پر ایک زمانے میں پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح قصبہ رونا ہی، ضلع فیض آباد کے ایک اسلامی مدرسے میں بہار، بنگال کے طلباء کے نام کے ساتھ بہاری اور بنگالی کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب باقاعدہ رجسٹر میں کیا جاتا ہے۔ اس قسم کا امتیاز نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ ملک کے آئین کے خلاف بھی ہے۔ یہ سب کچھ بڑے بڑے علماء اسلام کی نگرانی میں ہو رہا ہے مگر کسی کو اس طرح کی باتوں پر اعتراض نہیں ہے۔ اس قسم کی باتیں اگر عوام میں ہوتیں تو زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی۔ یہ ان علماء میں ہیں جو اسلام کی تعلیمات کے علمبردار ہیں اور زور دار انداز میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر فضیلت نہیں۔ یہ حجۃ الوداع کے موقعے پر کی گئی رسول اکرم ﷺ کی تقریر پر وعظ کہتے ہوئے نہیں تھکتے اور خود تعصب سے باز نہیں آتے۔ ان فارغینِ مدارس میں بعض دوسری اخلاقی خرابیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس قسم کے معاملات اکثر مدرسوں میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں دوسروں کے مقابلے یہ بات کم ہے اور یہ یقیناً ان اخلاقی تعلیمات کا نتیجہ ہیں جو انھیں قرآن اور حدیث کی دی جاتی ہیں۔

تصوف کی تعلیم دل بدل سکتی ہے

مولانا جلال الدین رومی کا قول ہے:

''جو پرندہ زمین سے اوپر اڑتا ہے اگر چہ وہ آسمان میں نہیں پہنچتا مگر اتنا تو ہوتا ہے کہ حال سے بہت دور ہو جاتا ہے اسی طرح اگر کوئی درویش ہو جائے اور وہ کمالِ درویشی کو نہ پہنچے مگر اس قدر تو ہوتا ہے کہ مخلوق میں عوام کے گروہ سے ممتاز ہو جاتا ہے، اور دنیا کی زحمتوں اور جھمیلوں سے چھوٹ جاتا ہے اور ہلکا پھلکا بن جاتا ہے۔'' (نفحات الانس صفحہ ۷۰۰)

تصوف کی اخلاقی تعلیمات کو اگر نصاب میں شامل کر دیا جائے تو اس کے اچھے نتائج لازمی طور پر طلباء کے اخلاق پر پڑیں گے۔ تصوف تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ہے۔ صوفیہ حضرات کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر کوئی ان کے پاس روحانی تعلیم کے لئے آتا تو وہ اس سے مجاہدہ بھی کرایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی امیر دوزیر بھی ہوتا تو اسے اس منزل سے گزرنا پڑتا تھا۔ کشمیر کے معروف صوفی شیخ العالم حضرت حمزہ رینہ رحمۃ اللہ علیہ تو اس دوران بڑے بڑے امراء اور وزراء کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کا حکم دیتے تھے اور مہینوں انھیں خانقاہ میں جھاڑو لگانے اور باورچی خانے میں کھانا پکانے کی ذمہ داری سنبھالنی پڑتی تھی۔ اس کا مقصد باورچی خانے کے ملازمین کی کمی پوری کرنا ہرگز نہ تھا بلکہ یہ کام ان سے انکے تزکیۂ قلب کے لئے لیا جاتا تھا۔ اسکی ایک زندہ مثال سکھوں کے گرداروں میں آج بھی دیکھنے کو ملتی ہے، جہاں بڑے بڑے رئیس بھی جوتے صاف کرنا اور اسکی دھول کو اپنے ماتھے سے لگانا باعث افتخار جانتے ہیں۔ یہاں گردوارے کے کاموں کے لئے لوگ انتہائی شوق سے خود کو وقف کرتے ہیں۔ سکھ ازم چونکہ تصوف سے متاثر ہے، لہٰذا یہاں کئی صوفیانہ روایتوں کی جھلک دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اونچے عہدوں پر فائز افراد میں اکثر احساسِ برتری اور انانیت کے جذبات ابھر آتے ہیں۔ مجاہدہ اسی احساس کو ختم کر کے آدمی کے اندر انکساری لاتا ہے۔ اسے بندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے، اسے یہ بتاتا ہے کہ وہ اللہ کا ایک معمولی بندہ ہے۔ وہ اس دنیا میں اپنے رب کے عرفان کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اسکے دل کے بھید پر بھی ہر لمحے اللہ کی نظر ہے اور وہ اسکے ایک ایک کام کا حساب عنقریب لینے والا ہے۔

تصوف کی تعلیم اور تربیت انسانی شخصیت میں بڑی تبدیلی لاسکتی ہے۔ طلباء پر اسکے مثبت اثرات مرتب ہوسکتے ہیں اور بجا طور پر یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اخلاقی خوبیوں اور اچھی صفات سے مالا مال ہوسکتے ہیں۔ جو روحانی صفات اہلِ مدارس وخانقاہ کی شناخت رہی ہیں، افسوس کہ آج انھیں کا فقدان ہوتا جارہا ہے اور ایک حد تک اس کمی کو تصوف کی تعلیم اور روحانی تربیت سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام طلباء کو صوفی بنا دیا جائے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ، اگر تصوف کی تعلیم نے طلباء کے اندر کچھ اخلاقی خوبیاں پیدا کردیں تو اس سے وہ پوری زندگی ایک اچھے اور ذمے دار انسان کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہ قتل وغارت گری، تشدد، رشوت ستانی، بدعنوانی، جھوٹ، غیبت، حسد اور دوسری غیر اخلاقی باتوں سے بچ سکتے ہیں۔ تصوف کو مدرسوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل کرنا چاہئے۔ اس سے طلباء کے اندر اچھی صفات پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

آخری بات

مشرقی ممالک میں، مغرب کی ذہنی غلامی کا رواج ہے، اسی لئے سمجھ لیا گیا ہے کہ جو تعلیم انسان کو روٹی نہ دے سکے، اسکی کیا ضرورت؟ وہاں ہر بات روٹی سے شروع ہو کر روٹی پر ختم ہوجاتی ہے۔ انکے ہاں اخلاقی اور روحانی قدریں اس لئے بیکار ہیں کہ ان سے دولت حاصل نہیں ہوتی، عیش وعشرت کی زندگی نہیں ملتی۔ مشرق بھی اسی راستے پر چل رہا ہے اور روحانی واخلاقی علوم سے پہلو تہی کررہا ہے، مگر بھارت جیسے مشرقی ممالک کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ روحانی اور اخلاقی قدروں سے دور ہو کر اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور ماضی کی وراثت سے بھی دور ہوجائیں گے۔ اگر ہم مغرب کی طرح اپنی پرانی قدروں سے بے نیاز ہو کر انجانے راستوں پر چل پڑے تو ہماری کوئی منزل نہ ہوگی اور ہم ظلمت کی کسی ایسی کھائی میں جاگریں گے جہاں سے باہر آنا مشکل ہوگا۔ تصوف ہمیں اپنی تاریخ اور تہذیب سے جوڑتا ہے اس سے دور ہو کر ہم بہت کچھ کھوتے جارہے ہیں، جس کا احساس ہمیں شاید دیر سے ہو۔

(غوث سیوانی، جدید دنیا کے مسائل اور تصوف، صفحہ ۲۴۲ تا ۲۵۷)

پندرہواں باب

ڈپریشن سے بچاؤ کی صوفیانہ تدبیریں

ڈپریشن سے بچاؤ کی صوفیانہ تدبیریں

ذہنی تناؤ اور ڈپریشن کے بنیادی اسباب درج ذیل ہیں۔

۱۔ دولت کے حصول میں ناکامی۔

۲۔ دولت کا نقصان۔

۳۔ نوکری کا چھوٹ جانا یا شیئر بازار کے گرنے سے نقصان۔

۴۔ کسی عزیز کے بچھڑنے کا غم۔

۵۔ جان و مال کے نقصان کا ڈر۔

۶۔ بچوں میں ڈپریشن کے اسباب عموماً والدین کا دباؤ یا والدین کے خراب تعلقات ہیں۔

ان اسباب میں بیشتر کا تعلق مال سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرض بھی مادہ پرستی کی دین ہے۔ لہٰذا دولت کی چاہت کو اگر کم کیا جا سکے تو یہ مرض بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ تصوف مادہ پرستی اور دولت کی چاہت کو انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس راستے پر چلنے کی پہلی شرط یہی ہے کہ اپنے مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اگر آدمی ایسا نہ کرے تو وہ سلوک کے راستے پر چل بھی نہیں سکتا۔ بہرحال اس راستے پر چلنے کا ارادہ نہ ہو تو بھی

بعض صوفیانہ افکار کو اپنا کر زندگی میں بہت حد تک بدلاؤ لایا جا سکتا ہے۔ روپے، پیسے زندگی کی بنیادی ضرورت ہیں ۔ انکے بغیر ایک قدم چلنا بھی ممکن نہیں، مگر اتنا تو ممکن ہے کہ آدمی اپنی ضرورتوں کو کم کر لے اور جو مل جائے اس پر صبر و شکر کرے۔ دولت کی چاہت میں ایسی دیوانگی نہ اختیار کرے کہ محرومی کی صورت میں اسکی جان پر بن آئے ۔ اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ پیسہ زندگی کے لئے ہے نہ کہ زندگی پیسے کے لئے۔ پیسہ اہم ہو سکتا ہے مگر زندگی اس سے زیادہ اہم ہے لہٰذا اسے پیسے کے لئے داؤ پر نہ لگایا جائے۔

اس سلسلے میں صوفیہ کا پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ دولت جمع ہی نہ کرو کہ اس میں دل لگا رہے۔ جیسا کہ شیخ فضل رازی کو میراث میں ایک لاکھ چاندی کے سکے ملے۔ آپ نے ان تمام سکوں کو پھینک دیا۔ (نفحات الانس، صفحہ ۳۲۳) اسی طرح حضرت رابعہ بصریہ فرماتی ہیں کہ دنیا کی دولت گندگی کی طرح ہے اور اسکے چاہنے والے کتے ہیں۔ (نفحات الانس) ایک صوفی کا قول ہے کہ دنیا کی دولت سے محبت کرنے والے کتے سے بدتر ہیں کہ کتا تو اپنی ضرورت پوری کر کے چلا جاتا ہے اور انسان دولت کے ڈھیر کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت والد (شاہ عبدالرحیم) نے فرمایا کہ خلیفہ ابوالقاسم فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے آرام کے لئے بھی فقیری اختیار نہیں کرتے یعنی جب طبیعت یکسو ہو اور تمام خطرات و وساوس دور ہو جائیں تو آدمی کو ظاہری حجاب کے باوجود بھی کلیۃً آرام وسکون حاصل ہو جاتا ہے۔'' (انفاس العارفین، صفحہ ۸۰۔۷۹)

سکونِ قلب کے لئے سب سے بہتر طریقہ صوفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی دولت دنیا سے دستبردار ہو جائے اور سب کچھ اللہ کے راستے میں خرچ کر دے، مگر اس طریقے پر عمل آج کے انسان کے لئے بہت مشکل ہے۔ اس کے لئے دوسرا طریقہ صوفیہ کے مسلک میں مل جاتا ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

> ''درویشی تین چیزوں کا نام ہے۔ لالچ کو چھوڑ دینا۔ اگر کوئی چیز پاس آجائے تو منع نہ کرنا اور جب کچھ مل جائے تو جمع نہ کرنا۔'' (نفحات الانس ترجمہ عبدالرحمٰن جامی، صفحہ ۴۰۴)

درویشی کی یہ وہ شکل ہے جس پر عمل کرنا ہر کسی کے لئے ممکن ہے۔ دولت کی ضرورت سے زیادہ لالچ ہی انسان سے غیر اخلاقی اور غیر قانونی کام کرواتی ہے لہٰذا اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو بہت سے برے کاموں سے بچا جا سکتا ہے اور حصول دولت کا جنون ڈپریشن اور پھر خودکشی تک نہیں لے جا پائے گا۔ زیادہ سے زیادہ کی چاہت ہی انسان کو دولت کے لئے بے رحم اور خونخوار جانور بننے پر مجبور کرتی ہے۔ آدمی کو سمجھ لینا چاہئے کہ کوشش کرنا اس کے ہاتھ میں ہے مگر اس کا رزلٹ اس رزّاق کے ہاتھ میں ہے، جو سب کو روزی دیتا ہے۔ ایک کسان زمین میں دانا ڈال سکتا ہے، پانی اور کھاد ڈال سکتا ہے لیکن کیا وہ اس دانے کو پودا بنا سکتا ہے؟ کیا اسے کیڑے مکوڑوں کی خوراک بننے سے بچا سکتا ہے؟ کیا اس پودے میں پھول اور پھل لگا سکتا ہے؟ کیا اسے موسم کی مار سے بچا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ کام تو وہی کر سکتا ہے جس نے اس دانے کو پیدا کیا ہے، جس نے اس کی پرورش زمین کے اندر کی ہے، اسے سڑنے گلنے سے بچایا ہے، جس نے اسے کیڑے مکوڑوں اور چڑیوں کی خوراک بننے سے بچایا ہے۔ جس نے اسے دانے سے انکور میں تبدیل کیا، پھر ایک نرم و نازک پودے کو پتھریلی زمین سے نکالا، اسے تناور درخت بنایا اور اس میں خوشبودار پھول و مزیدار پھل لگائے۔ جب آدمی کے ہاتھ میں کوشش کے سوا کچھ نہیں تو پھر وہ اپنی مرضی کے خلاف کام ہوتے دیکھ ڈپریشن کا شکار کیوں ہوتا ہے؟ حضرت ابوبکر ہمدانی نے اور دو باتیں کہیں کہ جو کچھ آ جائے اسے منع نہ کرے اور اسے جمع بھی نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیسہ انسانی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا، لہٰذا اسے آنے دو، بشرطیکہ جائز طریقے سے آتا ہو، پھر انسانی ضرورت اس کے جمع کرنے سے پوری نہیں ہوتی بلکہ خرچ کرنے سے پوری ہوتی ہے، اسلئے اسے خرچ کیا جائے۔

اللہ کی مرضی میں راضی رہنا اور اس کے آگے سرِ تسلیم کو خم کر دینا انسان کو ڈپریشن سے بچاتا ہے۔ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس کی اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا ہے۔ ایسے میں انسان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ ہر حال میں اُسی کی مرضی میں راضی رہے۔ صوفیہ کی تعلیمات میں اس کی خاص تلقین ملتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نعمتوں کو حاصل کرنے اور مصیبت و تکلیف سے بچنے کی کوشش نہ کر، اس لئے کہ اگر

تیری قسمت میں نعمت ہے تو تجھ کو ضرور مل کر رہے گی، تو اس کو طلب کرے یا ناپسند۔ اور اگر مصیبت و تکلیف تیری قسمت میں ہے اور تیرے لئے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے تو خواہ اسے ناپسند کرے یا دعاؤں کے ذریعے اسے دور کرے یا صبر کر اور جلدی جلدی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرے تو بھی تجھ پر مصیبت آ کر رہے گی۔'' (فتوح الغیب، مقالہ ۱۴)

آدمی خوش ہو یا ناخوش مگر اللہ کی مرضی کے مطابق ہی اس کائنات کا نظام چلتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے اللہ کی مرضی میں راضی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ یہ سوچ اگر دل میں راسخ ہو جائے تو بہت حد تک ڈپریشن سے بچا جا سکتا ہے اور اس قسم کی دوسری بیماریاں بھی نہیں پیدا ہونگی۔ اسی طرح اگر آدمی اپنی ضرورتیں کم کر لے تو بھی بہت حد تک ڈپریشن سے محفوظ رہنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اہل تصوف کا ماننا ہے کہ آدمی اپنی ضرورتوں کو کم کر لے تو اس سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر ضرورتیں کم ہونگی تو دولت کے حصول کی جدوجہد بھی کم ہوگی اور جو وقت بچے گا اس میں اپنے مالک کی عبادت کی جا سکتی ہے۔ دوسرے دولت کی ہوس میں جو غلط کام انسان کرتا ہے اس سے بچ سکتا ہے۔ تیسرے جو کچھ آدمی کماتا ہے یا خرچ کرتا ہے اس کا حساب بھی اسے اللہ کو دینا ہے، چوتھے یہ دولت کا جنون جو ڈپریشن جیسی بیماریوں کو جنم دیتا ہے اس سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اپنے دور کے مشہور صوفی، شاعر اور عالم مولانا عبدالرحمن جامی نے لکھا ہے:

''شیخ ابو محمد العتابدی رحمۃ اللہ علیہ روزانہ صرف اتنا کماتے تھے کہ دو روٹیاں پک سکیں۔ ایک روٹی وہ خود کھاتے دوسری خیرات کر دیتے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ، چالیس سال ہو گئے میں نے چراغ نہیں جلایا ہے، یعنی اس کے حساب سے ڈرتا ہوں کہ اس کے جلانے کے لئے کتنا کمانا چاہیے، کیونکہ ہر چیز کا حساب ہوگا۔'' (نفحات الانس، صفحہ ۲۶۲)

''حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر نمک سے کھا لیتے اور فرماتے جو دنیا میں اتنی مقدار پر راضی ہو جاتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔'' (مکاشفۃ القلوب، باب ۳۴)

آدمی کو اگر دنیا میں رہنا ہے تو یقیناً اسکی ضرورتیں بھی ہونگی، جن میں سب سے بنیادی ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان ہے۔ ان ضرورتوں سے نظر بچانا ممکن نہیں۔ پھر اگر اسکے ماں باپ ہیں، بال بچے ہیں یا دیگر اعزا و اقربا ہیں تو انکی ضروریات بھی ہونگی، ایسے میں اس کے لئے کچھ

جدوجہد بھی ضروری ہے، روزگار کی کوشش بھی لازم ہے۔ تصوف اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کر لے۔ اسے اسی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے الگ رہنا ہے جیسا کہ چشتی سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''ترک دنیا سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے تئیں ننگا رکھے اور لنگوٹا باندھ بیٹھ جائے بلکہ دنیا چھوڑنا اس بات کا نام ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے۔ لیکن جو کچھ اسے ملے اس کی طرف راغب نہ ہو اور نہ اس سے دل لگائے۔'' (فوائد الفواد، جلد۔ ۱، مجلس۔ ۶)

نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے ملفوظات نے بات صاف کر دی کہ تصوف یہی ہے کہ آدمی اس دنیا میں رہ کر بھی اپنے دل کو دنیا سے الگ رکھے۔ یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ صوفیہ کا ایک طبقہ ایسا بھی رہا ہے جن پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں تھا۔ ایسے لوگوں کو روزگار کے لئے جدوجہد کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ انکے پاس اگر روپے پیسے آ بھی جاتے تو وہ فوراً خیرات کر دیتے ایسے صوفیوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ ایک ایسا ہی واقعہ جامی نے درج کیا ہے۔ مصر کے ایک صوفی حضرت بنان بن محمد حمال کی سرگزشت ہے جن کا تعلق تیسری صدی ہجری سے ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک بار میں مکہ معظمہ میں تھا میرے ساتھ ایک نوجوان درویش بیٹھا تھا۔ ایک شخص نے درہموں کی تھیلی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اس شخص نے کہا کہ پھر آپ ان کو مسکینوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیں۔ چنانچہ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ وہ تمام چاندی کے سکے مسکینوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیئے، اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔ اسی دن رات کے وقت اس نوجوان کو میں نے دیکھا کہ وادی میں اپنے لئے کچھ کھانا ڈھونڈ رہا ہے۔ میں نے کہا کہ کاش تم درہموں کی تھیلی میں سے اپنے لئے کچھ درہم بچا کر رکھ لیتے! اس نوجوان نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت تک زندہ رہونگا۔''

(نفحات الانس، صفحہ ۳۵۴)

سوال یہ ہے کہ ایسے شخص کو کیا کبھی دولت کے نقصان کا صدمہ ہو سکتا ہے؟ یا اس کے نہ ملنے کا غم ہو سکتا ہے؟ ہر گز نہیں! پھر اسے ڈپریشن بھی نہیں ہو سکتا اور وہ دولت کی چاہت میں پاگل ہو کر خودکشی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے لئے اس راستے پر چلنا مشکل ہی نہیں لگ

بھگ ناممکن ہے مگر ہم یہ تو کر ہی سکتے ہیں کہ اپنے اندر کے دولت کے جنون کو ختم کریں، اپنی ضرورتوں کو کم کریں اور جو کچھ مل جائے اس پر صبر کریں۔ اسے اللہ کی عطا سمجھیں اور اسکا شکریہ ادا کریں، اگر یہ صفات بھی ہم نے اپنے اندر پیدا کرلیں تو ہماری شخصیت میں زبردست تبدیلی آسکتی ہے اور ہم ان خامیوں سے بچ سکتے ہیں جو ایک دولت کے پجاری میں ہوتی ہیں۔

میرا مجھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے سب تور
تیرا تجھ کو سونپتے کیا لاگت ہے مور

تسلیم ورضا ڈپریشن سے بچانے والا ہے

بیشتر لوگ محض اس لئے ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے آس پاس کے افراد کو خود سے بہتر لائف اسٹائل کا مالک پاتے ہیں۔ دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر انسان کا احساسِ کمتری میں مبتلا ہونا فطری ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر انسان کو اللہ نے الگ الگ طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اگر ایک کے پاس دولت ہے تو دوسرے کے پاس تعلیم ہے۔ اگر کسی کے پاس عزت ہے تو کسی کے پاس شہرت ہے۔ کسی کے پاس اونچا عہدہ ہے تو کسی کے پاس کوئی اور خوبی ہے۔ انسان کو سمجھ لینا چاہئے کہ یہاں کسی کو بھی مکمل جہاں نہیں ملتا۔ کوئی نہ کوئی کمی ہر کسی کے پاس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے انتہائی دولت مند افراد میں سے ایک امریکی شہری بل گیٹس ہیں۔ ساری دنیا کی کمپیوٹر مارکیٹ پر چھائے ہوئے ہیں مگر اولاد کی دولت سے انھیں اللہ نے محروم رکھا ہے۔

آدمی کا دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر احساس کمتری کا شکار ہونا اور پھر ذہنی مریض ہونا اچھی بات نہیں۔ یہ مرض صرف ایک طریقے سے دور ہوسکتا ہے کہ آدمی صبر ورضا کا پیکر بن جائے اور اللہ کی مرضی میں راضی رہنا سیکھ لے۔ اس بیماری اور اس کے علاج کی طرف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک کتاب میں اشارہ کیا ہے۔

''اے محتاج اگر دنیا اور اہل دنیا نے تجھ سے منہ موڑ لیا ہے، اگر تو گمنام اور بھوکا پیاسا ہے، اگر برہنہ جسم، پیاسا جگر، ہر گوشۂ زمین، مسجد اور ویرانے سے دھتکارا ہوا ہے، اگر تو اسی طرح ہر دروازے سے لوٹایا ہوا ہے، ہر مراد سے محروم ہے۔ اے! شکستہ ارمانوں اور

آرزوؤں سے بھرے دل والے، ہرگز تو یہ بات نہ کہہ کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے تنگدست اور محتاج بنایا ہے اور دنیا تجھ سے اٹھالی ہے، اور مجھے اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے مجھے پریشان کیا، سکونِ قلب نہیں دیا۔ اس نے مجھے رسوا کیا ہے۔ دنیا میں سے کفایت بھر نہ دیا، اس نے مجھے گمنام بنایا۔ میرے بھائیوں اور مخلوق میں مجھے رفعت اور منزلت نہیں بخشی۔ دوسروں کو اس نے اپنی عظیم نعمتیں عطا فرمائیں۔ وہ رات دن اس کی عظیم نعمتوں میں محو ہیں۔ انھیں اس نے مجھ پر اور میرے ہمسایوں پر فضیلت دی ہے۔ حالانکہ ہم دونوں ایماندار اور مسلمان ہیں اور ہماری والدہ حضرت حوا اور ہمارے باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ تو نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ یہ سب کیوں کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ تیری مٹی ریت سے پاک اور عمدہ ہے اور صبر ورضا، علم ویقین اور موافقت کی صورت میں رحمتِ الٰہی کی بارش تجھ پر مسلسل برسنے والی ہے، اور تیرے ایمان وتوحید کی روشنیاں جمع ہونے والی ہیں۔ تیرے ایمان کا درخت اپنی بنیاد اور جڑ کے اعتبار سے مضبوط، قائم اور ثمردار بڑھنے والا گھنا اور بلند شاخوں والا ہے۔ اس میں ہر روز زیادتی اور نمو ہے۔ لہٰذا اسے پرورش کے لئے کسی کھاد وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے معاملے کو اس پر پورا کردیا اور تجھے آخرت میں جنت عطا فرمائی اور تجھے اس کا مالک بنایا۔ اسی طرح وہ آخرت میں تجھے ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا کہ نہ اسے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی کے دل پر ان کا وہم وگمان گزرا ہے۔"

(فتوح الغیب، مقالہ ۵)

ڈپریشن کا سب سے اہم سبب ہے اپنے آس پاس کے لوگوں کو اچھی حالت میں دیکھنا اور خود کو ان سے بری حالت میں محسوس کرنا ہے۔ دنیا میں جدوجہد کرنا انسان کے ہاتھ میں ہے مگر اس کا رزلٹ اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ایک کسان زمین میں دانہ تو ڈال سکتا ہے مگر اسے تناور درخت نہیں بنا سکتا، اس میں پھول اور پھل نہیں لگا سکتا۔ جب نتیجہ اس کے ہاتھ میں نہیں تو لاکھ وہ پریشان ہو حالات کو بدل نہیں سکتا۔ البتہ وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دے سکتا ہے کہ جس جدوجہد کا نتیجہ اسے دنیا میں نہیں دیکھنے کو ملا وہ آخرت میں ضرور دیکھنے کو ملے گا۔ اللہ کی مرضی کے سامنے اپنے سر کو جھکا دینا انسان کو ڈپریشن اور ذہنی تناؤ سے بچاتا ہے۔

دل انسان کا سرمایہ ھے

سوگندھ بے دلوں کی، تجھے اے خدائے دل
دینا ہو کچھ، مجھے تو نہ دینا سوائے دل

دل انسان کے جسم پر حکومت کرتا ہے، اس لئے اگر یہ درست رہے تو جسم کا نظام درست رہتا ہے اور اگر یہ بگڑ جائے تو نظام جسم بگڑ جاتا ہے۔ اسی لئے ظن وگمان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تصوف میں دل کی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہے، کیونکہ یہ وہ مرکز ہے جو پورے نظام کو بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شیخ ابوبکر محمد بن حامد ترمذی خراسان کے مشائخ میں ایک باہمت صوفی گزرے ہیں۔ آپ کا قول ہے:

"تمہارا سرمایہ صرف تمہارا دل ہے اور یہی تمہارا وقت ہے، لیکن جب تم نے اپنے دل کو ظن وگمان میں، جو دل میں پیدا ہوں مصروف و مشغول کر دیا تو سمجھ لو کہ تم نے اپنے اوقات کو ان چیزوں میں ضائع کر دیا جن میں ضائع نہیں کرنا چاہئے تھا، تو وہ شخص کس طرح نفع کما سکتا ہے جس کے سرمایہ کو نقصان پہنچ چکا ہے۔" (نفحات الانس، صفحہ ۳۵۱)

دل آدمی کا سرمایہ ہے، کسی کے بارے میں زیادہ بدگمانی سے اس سرمایے کو نقصان پہنچتا ہے اسی لئے اسے پاکیزہ رکھنے کو کہا گیا ہے۔

نہائے دھوئے کا بھیا، جو من میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے، دھوئے باس نہ جائے

آدمی کا دل اس کے لئے بہت اہم ہے۔ یہ اللہ کی عظیم نعمت ہے اس لئے اسے ہمیشہ بہتر رکھنا چاہئے۔ یہ اگر ٹھیک رہے تو پورا جسمانی اور روحانی نظام ٹھیک رہتا ہے اور اگر یہ بگڑ جائے تو تو پورا جسمانی اور روحانی نظام بگڑ جاتا ہے۔ حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"دل ایک شاہی خزانے کی حیثیت رکھتا ہے، مگر غور سے دیکھو اس خزانے میں تم کیا رکھتے ہو؟ اگر اس میں جواہرات بھرے ہیں تو بیشک یہ خزانہ کہا جا سکتا ہے اور اگر اس میں کوڑا کرکٹ ہے تو یہ گھاس پھوس کا انبار ہے۔ یہیں سے بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک خزانہ تو

بہشت میں ہے جس کو نعمت کہتے ہیں اور ایک خزانہ عارفوں کے دل میں ہے، اس کا نام محبت ہے۔ ربّ العزت کی قسم ہزاروں ہزار بہشت محبت کے خزانے کے ایک موتی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتے۔ بہشت کے خزانے کا محافظ ایک فرشتہ ہے، جس کا نام رضوان ہے اور محبت کے خزانے کا نگہبان خود حضرت خداوند جل وعلا ہے۔“

(مکتوباتِ صدی، مکتوب ۸۰)

انسان کی دل تنگی کا سب سے بڑا سبب دنیا کی محبت ہے۔ جب آدمی دنیا اور اسکی ہماہمی میں مصروف رہتا ہے تو پھر وہ اسی کا ہو رہتا ہے۔ ایک دن مولانا جلال الدین رومی نے ایک دوست کو غمگین دیکھا تو فرمایا:

”یہ ساری دل تنگی اس دنیا سے محبت کی وجہ سے ہے۔ جوانمردی یہ ہے کہ اس جہان سے آزاد رہے اور خود کو مسافر سمجھے۔ جس رنگ کو دیکھے اور جس مزے کو چکھے سمجھ لے کہ یہ اسکے ساتھ نہیں رہیگا۔ جب ایسا کریگا تو دل تنگ نہیں ہوگا۔“ (نفحات الانس، صفحہ ۷۰۰)

مالی آوت دیکھ کر کلیاں کریں پکار
پھولی پھولی چن لئے کل ہماری بار

اوپر کے چند جملوں نے دل تنگی کا سبب بھی بتا دیا اور اس کا علاج بھی۔ بہت صاف بات ہے کہ اگر آدمی اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی دنیاداری سے دور رہے تو جس قدر وہ دنیا کے جھنجھٹ میں پھنس جاتا ہے نہ پھنسے۔ دنیا کی بے ثباتی کا تصور اگر اس کے ذہن میں ہوگا تو وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی الگ ہوگا۔

چلتی چاکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوئی پٹ بھیتر آئی ثابت گیا نہ کوئے

دل کا سکون اللہ کے ذکر میں ہے

ذہنی سکون کے لئے مختلف راستے تلاش کئے جاتے ہیں مگر جو ایک اکیلا راستہ ذہنی سکون اور دل کے اطمینان کے لئے ہے، اس کی طرف کم ہی لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔ یہ راستہ صوفیوں کا

راستہ ہے۔ یہ طریقہ اللہ والوں کا طریقہ ہے۔ ذہنی اور قلبی سکون کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل سے دنیا اور دولت دنیا کی محبت نکال لے، پھر وہ یکسو ہو کر اپنے خالق و مالک کو یاد کرے۔ یہ بات قرآن میں بھی کہی گئی ہے کہ:

''بیشک اللہ کو یاد کرنے سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔''

دلی سکون کا یہی ایک علاج ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ جب کہیں ذکر خدا کی محفل ہوتی ہے یا علماء وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو بہت سے لوگوں کو نیند آنے لگتی ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ دلوں کو سکون مل رہا ہے۔ کبھی ناچ گانے اور راگ و رنگ کی محفلوں میں لوگوں کو سکون سے سوتے ہوئے نہیں دیکھا جاتا۔ صوفیوں نے ذہنی اور قلبی سکون کے لئے اسی طریقے کو اپنایا ہے۔ وہ جب اللہ کو یاد کرنے میں لطف پاتے ہیں تو دوسرے کاموں کو چھوڑ کر اسی کام میں لگ جاتے ہیں۔

شیخ ابو جعفر محمد بن علی النسوی فرماتے ہیں:

''جو شخص اللہ کے علاوہ کے ساتھ سکون و قرار حاصل کرتا ہے تو اللہ اسکو چھوڑ دیتا ہے۔ جو شخص خداوند تعالیٰ کے ساتھ قرار حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسروں کے ساتھ اس کے سکون اور آسائش کے طریقوں کو ضائع کر دیتا ہے۔'' (نفحات الانس، صفحہ ۴۴۱)

شیخ ابو عمرو بن نجید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اللہ کے سوا کسی اور سے دل لگانا وحشت ہے۔'' (نفحات الانس، صفحہ ۴۴۸)

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''چونکہ ذکر اللہ کے ذریعے حق تعالیٰ کی بارگاہ کے ساتھ ایک قسم کی مناسبت ہو جاتی ہے اگرچہ (ذکر کو) اس پاک ذات کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں ہے۔ ماللتراب ورب الارباب (خاک کو پروردگار عالم کے ساتھ کیا نسبت ہے) لیکن ذکر کرنے والے اور جس کا ذکر کیا جائے اس کے درمیان ایک قسم کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، جو محبت کا سبب بنتا ہے، اور جب محبت غالب ہو گئی تو پھر اطمینان کے سوا کچھ نہیں ہے، اور جب معاملہ دل کے اطمینان کے حصول تک پہنچ گیا تو اس کو ہمیشہ کی دولت حاصل ہو گئی۔''

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب۔۹۲)

حضرت مجدد الف ثانی نے ایک دوسرے خط میں تحریر فرمایا:

"پانچوں وقت کی نماز اور سنن موکدہ بجالانے کے بعد اپنے تمام اوقات کو اللہ تعالیٰ جل سلطانہٗ کے ذکر میں مصروف رکھنا چاہئے اور اس کے سوا اور کسی چیز میں مشغول نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ وہ کھانے اور سونے کے اوقات ہوں یا آنے جانے کے اوقات۔"

(مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، مکتوب۔۹۳)

بابا فرید الدین گنج شکر نے اپنے پیرو مرشد کے حوالے سے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی یہ بات نقل کی ہے کہ:

"جب تک انسان دنیاوی زنگار محبت کی صیقلی کو اپنے دل سے دور نہیں کرتا اور فکر حق سے انس نہیں کرتا اور غیر کی ہستی کو درمیان سے اٹھا نہیں دیتا وہ ہرگز اللہ کا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد کہا، تحفۃ العارفین، میں شبلی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں صلاحیت کی بنیاد آدمی میں ہوتی ہے۔ وہ دل کی صلاحیت سے تعلق رکھتی ہے۔ جب دل صلاحیت اختیار کر لیتا ہے تو آدمی کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ پھر فرمایا دل مردہ بھی ہوتا ہے اور زندہ بھی۔ اللہ کے کلام میں ہے دنیاوی کاموں کی کثرت سے دل مرجاتا ہے تو ذکرِ الٰہی سے اسے زندہ کرو۔ اس کے بعد فرمایا! جب دل دنیاوی لذتوں اور شہوتوں سے کھانے پینے میں مصروف ہو جاتا ہے تو غفلت کا اس پر اثر ہوتا ہے اور خواہش اس پر غالب آتی ہے۔ ہر طرف سے دل میں خطرے آنے شروع ہوتے ہیں، جو دل کو کالا کر دیتے ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی یاد دل کو کالا نہیں ہونے دیتی۔ جب دل کالا ہو جاتا ہے گویا وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ جس زمین میں کھاراپن زیادہ ہو وہ بیج قبول نہیں کرتی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زمین مردہ ہے۔ اسی طرح جس دل میں ذکر نہ ہو اس پر دیو پری اور مصائب غالب آجاتے ہیں۔"

(راحت القلوب، مرتبہ حضرت نظام الدین اولیا، مجلس۔۳)

کہا جاتا ہے کہ جس گھر میں انسان نہ بستا ہو اس میں بھوت پریت کا بسیرا ہو جاتا ہے۔ یہ بات تو محض ایک کہاوت ہے مگر یہ ایک مثال بھی ہے کہ جس دل میں اللہ کی یاد نہ ہو، اس میں بھی ویرانی آجاتی ہے۔ اسی کو دل کا کالا ہونا اور زنگ آلودہ ہونا بھی کہا جاتا ہے یعنی دنیا داری

میں مشغولیت کے سبب دل جب زنگ آلودہ ہو جائے تو اسے صیقل کرنے کا یا چمکانے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو یاد کرلے۔ اس سے زنگ دور ہو جائے گا اور دوبارہ اس میں چمک آجائیگی۔ مردہ دلی، اسی کو کہتے ہیں کہ انسان خدا کو بھول جائے۔ اصل میں انسان کی اصلاح کا تعلق، دل کی اصلاح سے ہے اگر دل ٹھیک ہو جائے تو پورا جسم اور کردار درست ہو جاتا ہے اور اگر دل بگڑ جائے تو جسم کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ اسی لئے صوفیہ دل کو درست کرنے پر زور دیتے ہیں۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن رازی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''معرفت اس حجاب کو اٹھا دیتی ہے جو بندے اور خدا کے بیچ ہوتا ہے،،

(نفحات الانس صفحہ۔۴۴۹)

اصل میں تصوف کی بنیاد ہی خدا کی محبت پر ہے۔ یہ محبت اگر مضبوط ہوتی ہے تو آدمی کے اندر بہت سی اخلاقی تبدیلیاں آتی ہیں اور اگر یہ محبت کمزور ہو تو بھی کچھ نہ کچھ آدمی میں بدلاؤ تو ضرور آتا ہے۔ جو اپنے خالق و مالک کی محبت کو حاصل کرلے اسے اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہتی۔ امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے مکاشفۃ القلوب میں لکھا ہے کہ، حضرت زلیخا نے یوسف کی محبت میں اپنا حسن و جمال اور ملک و مال قربان کر دیا۔ ان کے پاس ستر اونٹوں کی بوجھ کے برابر ہیرے جواہرات تھے، جنھیں عشقِ یوسف میں نثار کر دیے مگر جب انکی زوجیت میں آئیں تو دور دور رہنے لگیں۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ پہلے مجھ سے دور رہنا گوارا نہیں تھا اور اب قریب نہیں آتیں، تو انھوں نے جواب دیا پہلے میں یوسف کی دیوانی تھی مگر اب یوسف کو بنانے والے کی دیوانی ہو گئی ہوں۔ اس کی محبت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں۔

سمرن سے من لائیے، جیسے پانی مین
پران تجے، چھن بچھڑے، ست کبیر کہہ دین

یہ محبت ہر محبت سے نرالی ہے۔ اسکا انداز سب سے جدا ہے۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے جسے اس سے کچھ حصہ مل جائے۔ انسان، اپنے بچوں سے، اپنے والدین سے، اپنے دوستوں اور رشتے

داروں سے محبت کرتا ہے۔ اسے ہر محبت سکون اور لطف دیتی ہے، لیکن اگر وہ اپنے خالق سے محبت کرنے لگے تو اسے احساس ہوگا کہ یہ محبت ہر محبت سے زیادہ لطف دینے والی ہے۔ اس میں جو دل کو اطمینان اور قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔

امام غزالی نے لکھا ہے کہ:

''جب منصور حلاج کو قید میں اٹھارہ دن گزر گئے تو جناب شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے پاس جا کر دریافت کیا اے منصور محبت کیا ہے؟ منصور نے جواب دیا آج نہیں کل یہ سوال پوچھنا۔ جب دوسرا دن ہوا اور ان کو قید سے نکال کر مقتل کی طرف لے گئے تو وہاں منصور نے شبلی کو دیکھ کر کہا شبلی! محبت کی ابتدا جلنا اور انتہا قتل ہو جانا ہے''۔ (مکاشفۃ القلوب، باب ۱۰)

یہ کہنے کے بعد منصور قتل ہو گئے۔ اور وہ بلکل ہی خوفزدہ نہیں تھے بلکہ خوشی کی حالت میں مسکراتے ہوئے اپنی جان، جان آفریں کے حوالے کی۔ اللہ کے راستے میں اپنی جان دینے والے جس ذوق اور شوق کے ساتھ اپنی جان دیتے ہیں، وہ بھی بہتوں کے لئے حیرت انگیز ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے لئے بھی یہ کیفیت حیران کن ہوتی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں جب مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں، انکی انگلیاں کٹ گئیں اور انھیں کٹنے کا احساس تک نہیں ہوا، کیونکہ حسنِ یوسف نگاہوں کے سامنے تھا، اور جب نگاہوں کے سامنے خالقِ یوسف ہو تو گردن کے کٹنے کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ جب عاشق کی جان جاتی ہے تو اس کے سامنے خود اللہ کا جلوہ ہوتا ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

مالک کی محبت میں جان دینا

صوفیہ کی نظر میں سب سے پسندیدہ کام ہے اپنے خالق و مالک سے محبت کرنا۔ اسلئے کہ تصوف کی بنیاد ہی محبت پر کھڑی ہے۔ جو اخلاقی خوبیاں آدمی کے اندر آجاتی ہیں وہ تو اس کے طفیل میں آجاتی ہیں۔ جس طرح ہر محبت کرنے والے کو اپنے محبوب کا دیدار پسند ہوتا ہے اسی طرح ایک صوفی کے لئے اپنے مالک کا دیدار محبوب ہوتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے

ملفوظات میں ہے کہ:

''ابراہیم خواص علیہ الرحمہ نے چند آدمیوں کو ذکر کرتے دیکھا تو ان پر وجد طاری ہو گیا۔ وہ رقص کرنے لگے۔ سات دن رات رقص کرتے کرتے، بے ہوش ہو جاتے۔ جس وقت ہوش آتا تو تازہ وضو کرتے، جونہی اللہ کا نام زبان پر آتا بے ہوش ہو جاتے، سر سجدہ میں رکھ کر یا اللہ کہا اور جان بحق ہو گئے۔'' (دلیل العارفین' مرتبہ' قطب الدین بختیار کاکی' مجلس۔۴)

بھلا ہوا موری مٹکی پھوٹی ری
میں تو پنیا بھرن سے چھوٹی ری

اسی طرح ملفوظاتِ خواجہ معین الدین چشتی میں ہے حضرت رابعہ بصریہ سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھا کام کونسا ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

''اپنے وقت کو اللہ کی یاد میں بتانا، جو شخص بزرگی کا دعویٰ کرے اور اس میں مراد پائی جائے تو سمجھو وہ جھوٹا ہے، محبت کے دعوے میں۔'' (دلیل العارفین، مجلس۔۱۱)

یہی ذکر اور محبت کے جذبات انسان کے دل کو غم دنیا سے آزاد کر دیتے ہیں، ہر فکر سے الگ کر دیتے ہیں اور ایک ایسی تڑپ اس کے دل میں جگا دیتے ہیں، جو اسے ہر تڑپ سے دور کر دیتی ہے۔

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خواجہ معین الدین چشتی نے فرمایا کہ:

''راہِ محبت میں عاشق وہ ہوتا ہے جو دونوں جہان سے دل کو الگ کر لے۔ محبت کے چار معنیٰ ہیں۔ پہلے ذکرِ الٰہی میں دل و جان سے خوش رہنا، دوسرے ذکرِ حق کو بلند کرنا، تیسرے دنیا کی گندگی سے تعلق کو توڑ لینا، چوتھے اپنے اور اس کے سوا سب کی حالت پہ رونا۔'' (دلیل العارفین، مجلس۔۱۰)

خدا کی محبت تب ہی مکمل ہوتی ہے، جب دنیا کی ہر چیز کی محبت پر، یہ محبت غالب آجائے، یعنی آدمی اپنی اولاد، والدین اور تمام عزیزوں سے بڑھ کر خدا کی ذات سے محبت کرنے لگے۔ خدا

کی محبت اگر غالب آگئی تو آدمی کی زبان پر اسی کا ذکر سب سے زیادہ ہوگا۔ یہ ذکر دل اور زبان دونوں سے ہوگا۔ جب ایسا ہوگا تو انسان ہر فکر سے نجات پالے گا اور اسے دلی اور قلبی سکون مل جائے گا۔ جو اس مقام پر پہنچ جائے گا اس کے لئے ذہنی تناؤ اور ڈپریشن کا کوئی مطلب نہیں رہ جائے گا، لیکن اگر اس مقام تک نہیں پہنچ پایا تو بھی اس کی شخصیت میں کئی اہم تبدیلیاں ضرور رونما ہونگی اور وہ زندگی میں حاصل ہونے والی ناکامی کو بھی اللہ کی مرضی تصور کریگا۔ ایسی حالت میں وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے ایک موقع پر آنکھوں میں آنسو بھر کر فرمایا کہ:

> "جو محبت کا دعویٰ کرے اور مصیبت کے وقت فریاد کرے وہ سچا نہیں بلکہ جھوٹا دوست ہوتا ہے۔ دوستی اس بات کا نام ہے کہ جو کچھ دوست کی طرف سے آئے اس پر راضی رہے اور لاکھوں شکر بجالائے، کہ شاید وہ اس بہانے یاد کرے۔ اس کے بعد رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کے متعلق فرمایا کہ جب ان پر کوئی بلا نازل ہوتی تو آپ خوشی سے کہتیں۔ آج اس بڑھیا کو دوست نے یاد کیا۔ جس روز تکلیف نہ ہوتی تو رو کر کہتیں، آج کیا ہو گیا اور مجھ سے کیا غلطی ہوگئی کہ مجھے یاد نہیں کیا گیا۔" (فوائد السالکین مجلس ۲)

مشق ستم فرماتے رہیے
یوں ہی مجھے تڑپاتے رہیے

محبوب کی ہر چیز محب کے لئے باعث خوشی ہوتی ہے۔ وہ اسکے غم کو بھی اپنے دل سے لگائے رہتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ یہ محبت کے تکمیل کی علامت ہے، جو اچھے وقت میں کسی کے ساتھ رہے مگر برے وقت میں اسے چھوڑ دے وہ سچا دوست نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح اگر بندہ اللہ سے سچی محبت کرتا ہوگا تو اسکی طرف سے ملنے والے ہر غم کو ذوق وشوق سے برداشت کرے گا۔ یہ غم اسے ہر غم سے نجات دلا دے گا۔ یہ ایک فکر اسے ہر فکر سے آزاد کر دیگی۔ ایک بار پھر پڑھئے:

> "بیشک اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔"

(غوث سیوانی، جدید دنیا کے مسائل اور تصوف، صفحہ ۲۶۳ تا ۲۸۰)

سولہواں باب

صوفیاء کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت

ملفوظات کی تاریخی اہمیت

صوفیاء کے ذریعہ لکھے گئے ملفوظات صرف مذہبی معلومات کا ذریعہ نہیں ہیں، بلکہ ایک تاریخی ماخذ کا خزانہ ہے۔ملفوظات اور تذکرہ ایک ایسا تاریخی ماخذ ہے، جن سے اس عہد کی سماجی صورت حال کا پتہ چلتا ہے۔صوفیاء کے ذریعہ خانقاہ میں کی گئی تقریر جو اس عہد کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے اسے ملفوظ کہتے ہیں جنہیں روزانہ لکھنے کا کام بھی کیا جاتا تھا۔گزرے ہوئے صوفی کے سلسلے میں کچھ کہنے یا ان کے حالات زندگی کو مرتب کرنے کو تذکرہ کہا جاتا ہے۔جیسا کہ ''سیر الاولیاء'' لکھا گیا۔

عہدِ وسطیٰ کے فارسی مورخین نے ایرانی تاریخ نویسی کی روایت کو اپناتے ہوئے اپنی تحریر میں صرف سلطنت اور اس کی سیاسی صورت حال پر ہی روشنی ڈالا ہے۔سلطان اور سلطان کے دربار اور امیروں کی حکمت عملی کو ہی اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔عام آدمی اور معاشرتی زندگی کے سلسلے میں روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔یہی سبب ہے کہ یورپین مورخ ''اینالس' کی تاریخ نویسی کے نظریہ سے دیکھا جائے تو ان کے ذریعہ لکھی گئی تاریخی کتابوں سے نامکمل معلومات ملتی ہیں۔لیکن ان فارسی مورخین کے ساتھ صوفیاء نے جو ملفوظات اور تذکرے لکھے ہیں، ان کو جوڑ دیا جائے تو

ایسی صورت میں ان فارسی مورخین کی کمیاں پوری ہو جائیں گیں اور عہد وسطیٰ کی تاریخ کے صحیح واقعات کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

ملفوظات اور تذکرے کی کتابوں سے ہمیں اس دور کے صوفیاء کے افکار و خیالات اور ان کے تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ اس عہد کے سماج کی مالی صورت حال کیسی تھی نیز ان کے مذہبی خیالات وافکار کیسے تھے؟ سماج میں کن رسم ورواج کی چلن تھی؟ سماجی دلچسپیاں اور ان کے مسائل کا علم ان ملفوظات سے حاصل ہوتا ہے۔

ان ملفوظات اور تذکرے سے ہمیں صوفیاء اور علماء کے درمیان پائے جانے والے رشتے، سلطان اور صوفی کے درمیان کے رشتے اور سلطان کی مذہبی سوچ نیز ان کی زندگی میں مذہب کے تئیں رواداری کے بارے میں پتہ چلتا ہے۔

جتنی بھی مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سماجی صورت حال کو بڑے خوبصورت انداز سے واضح کیا گیا ہے۔ ''بھگتی آندولن'' کے 'سنت کبیر' 'دادو' وغیرہ سبھی نے اپنی تحریر میں سماجی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے کہ اس وقت پچھڑے ہوئے نچلی سطح کے لوگوں کی سماجی صورت حال کیسی تھی؟ ان کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

خانقاہ اور صوفیاء کا رشتہ صحیح معنی میں سماج سے جڑا ہوا تھا، جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں ہندوستان کی سماجی زندگی کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کے مقابلے میں عہد وسطیٰ کے فارسی مورخ ضیاء الدین برنی، ابوالفضل اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے مورخوں کا تعلق سلطان اور اس کی سلطنت کے دائرے تک ہی محدود تھا۔ عام آدمی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر میں سلطنت اور سلطان اور امراء کی سیاسی حکمت عملی کا خلاصہ ہے اور ان پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کچھ صوفیاء کے اہم ملفوظات کی فہرست

1.	خواجہ معین الدین چشتی:	''دلیل العارفین''
2.	خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر:	''راحتہ القلوب''
3.	خواجہ قطب الدین بختیار کاکی:	''فوائد السالکین''

5. شیخ نظام الدین اولیاء: ''فوائد الفواد''
6. شیخ نظام الدین اولیاء: ''سیر العارفین''
7. شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی: ''خیر المجالس''
8. سید بندہ نواز گیسو دراز: ''جوامع الکلم''
9. شیخ برہان الدین غریب: ''احسان الاقوال'' اور ''نفائس الانفاس''
10. شیخ شرف الدین بن یحییٰ منیری: ''خیابانِ پرنعمت'' اور ''معدن المعانی''
11. مخدوم جہانیاں کے صاحبزادے سراج الدین شاہ عالم: ''ملفوظات شاہ عالم''
12. سید جلال الدین جہاں گشت ''الدر المنظوم'' اور ''خزانہ جواہر جلالیہ''
13. شیخ اسد خیر آبادی: ''تحفۃ السعد''
14. شیخ جمشید راجگیری: ''ملفوظات حضرت اکھی جمشید راجگیری''
15. شیخ مقصود شاہ مینا لکھنوی: ''ملفوظات شاہ مینا لکھنوی''
16. شیخ عبد القدوس گنگوہی: ''لطائف قدوسی''
17. شیخ احمد کھٹو گنج بخش: ''تحفۃ المجالس''
18. شیخ وحید الدین: ''ملفوظاتِ شیخ وحید الدین گجراتی''
19. شاہ رکن الدین ستاری: ''ملفوظات شاہ رکن الدین ستاری''
20. شیخ عبد الرزاق ہانسوی: ''ملفوظاتِ شیخ عبد الرزاق ہانسوی''
21. سید حسن رسول نما: ''مناقب حسن'' اور ''فوائح العرفان''
22. شیخ شاہ کلیم اللہ شاہ جہان آبادی: ''مجلسِ کلیمی''
23. خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی: ''احسان الشمائل'' اور ''ملفوظات خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی''
24. شاہ عبد العزیز محدث دہلوی: ''ملفوظاتِ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی''
25. شاہ غلام علی دہلوی: ''درّ المعارف''[1]

ان سبھی ملفوظاتوں کے مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف مذہبی کتاب نہیں ہیں، بلکہ ان ملفوظاتوں سے ہمیں بہت ساری تاریخی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ان ملفوظاتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے علاقائی حکمرانوں کی کیا صورت حال تھی۔خاص طور سے ہندو اکثریت والے علاقوں میں مسلمانوں کی کیا صورت حال تھی؟ نیز مسلم اکثریت والے علاقوں میں ہندو کیسے رہتے تھے۔سلطنت یا علاقائی حکومت کے مذہبی نقطہ نظر کیا تھے۔کن علاقوں میں کن رسم ورواج کی چلن تھی؟ سلطان اور بادشاہ کے سلسلے میں ایسے ایسے واقعات کی وضاحت کی گئی ہے، جو فارسی تاریخی کتابوں میں موجود نہیں ہیں۔ان ملفوظاتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے کن علاقوں میں کون صوفی رہتے تھے اور اس صوفی کا سماجی اور سیاسی رشتہ کیسا تھا، نیز عبادت اور ریاضت میں دیگر صوفیاء میں ان کا کیا مقام تھا۔ان ملفوظات کی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سلطان اور بادشاہ اور اس کی حکومت کا سلوک اور طرز عمل عام آدمی کے ساتھ کیسا تھا؟ عوام کن کن مسائل سے الجھ رہے تھے،ان سارے حقائق کو ان ملفوظات میں درج کیا گیا ہے۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب ''ملفوظات کی تاریخی اہمیت'' میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ہندوستان کی سماجی اہمیت کا تاریخی مطالعہ ملفوظات کے مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا ہے۔

''انالس اسکول آف تاریخ نویسی'' نے تاریخ لکھنے کے سلسلے میں ایک نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کوئی بھی تاریخ بغیر سماج کے مطالعہ کئے ہوئے مکمل نہیں ہوسکتا۔صرف راجا اور اس کی سیاست کو پڑھ لینے سے صحیح تاریخ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی ہے، بلکہ سماجی صورت حال اور ماحول کو دیکھتے ہوئے راجا اور اس کی سیاست کا مطالعہ کرنا ہوگا۔انالس اسکول آف تاریخ نویسی، کے اس خیال کو پوری دنیا میں قبول کیا گیا۔اس کے خیال کے مطابق ان ملفوظات کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔اسکے مطالعہ کے بغیر تمام تاریخی پہلوؤں کا مطالعہ کرنا اور سمجھنا ناممکن ہے۔

1. پروفیسر محمد اسلم، ملفوظات ادب کی تاریخی اہمیت، (اردو) لاہور، (1995)

کتابیات

(Bibliography)

(انگریزی)

1. ***Alsopp, Bruce.*** "A General History of Architecture from the Earliest civilisation to the present Day", Sir Issac Pitman and sons Ltd., London, (1995).
2. ***Bahadur, Krishna p.*** "Sufi Mysticism", ess ess Publications, New Delhi, (1999).
3. ***Brown, Percy*** "Indian Architecture Islamic Period", Bombay, (1956).
4. ***Baldick, Julian*** "Mystical Islam", I. B. Tauris and Co. Ltd., London, (1989).
5. ***Batley, Claude*** "Design Development in Indian Architecture", 3 Parts, John Tirant, London, (1914).
6. ***Catherine B. Asher*** "Cambridge History of India, Architecture of Mughal India", Delhi, (1940).
7. ***Cresswell, K.A.C.*** "Early Muslim Architecture", 2 Volumes, Oxford Calender Press, (1969).
8. ***Cunnigham, A.*** "Archaeological Survey of India Report", Vol. I, (Reprint) Varansi, (1969).
9. ***Delhi, Intech*** "Delhi the Built Heritage, A Listing", 2 Vol., Published by Intech Delhi, 1st Edition, (1999).
10. ***Desai, Ziyauddin, A.*** "Indo Islamic Architecture", Publication Division, Ministry of Information and Broadcasting, Govt. of India, New Delhi, (1979).
11. ***Engineer, Asghar Ali*** "Sufism & Communal Harmony", Printwell, Jaipur, (1991).
12. ***Fletcher, Bannister*** "A Grammar of Architecture on Comparative Method", Londo, (1961).

13. ***Fanshwae, H.C*** "Delhi, Past and Present", Vipin Jain, for Vintage Books, Gurgaon (Haryana), (1991).

14. ***Havell, E.B.*** "Indian Architecture Through the Ages", Asian Publication Services, Delhi, (1978).

15. ***Havell, E.B.*** "Indian Architecture and its Psychology Structure and History from the First Mohammadon Invasion to the Present Day", John Murray, Albemark Street, London, (19130.

16. ***Hill, Derek and Graber, Oleg.*** "Islamic Architecture and its Decoration, AD 800-1500", Faber and Fabe.., London, (1964).

17. **Hasan Maulvi Zafar** "A List of Mohammadan and Hindu Monuments", Delhi Province, 4 Vol., Superintendent Government Printing, Calcutta, (1992).

18. **Lethaby, W.R.** "Architecture and Introduction to the History and the Theory of the Art of Building", London, (1929).

19. ***Mujeeb, M.*** "The Indian Muslims", Montreal, (1967).

20. ***Mujeeb, M.*** "Islamic Influence on Indian Society", Meenakshi Prakashan, Meerut, (1972).

21. ***Michell, George, ed.*** "Architecture of the Islamic World, its History and Social Meening", Thames and Hudson Ltd., London, (1978).

22. **Nizami, K.A.** "Some Aspects of Religion and Politics in India during the 13th Century, Idara-e-Adabiat, Delhi, (1974).

23. ***Nath, R.*** "Islamic Architecture and Culture in India", B.R. Publishing Corp., Delhi, (1972).

24. **Nath, R.** "History of Sultanate Architecture", Abhinav Publication, New Delhi. (1978).

25. ***Nath, R.*** "Some Aspects of Mughal Architecture", Abhinav Publication, New Delhi, (1982-88).

26. ***Nath, R.*** "Monuments of Delhi", New Delhi, (1979).

27. ***Rizvi, S.A.A.*** "Fatehpur Sikri", Archaeological Survey of India. New Delhi, (1992).

28. ***Sunder Rajan, K.V.*** "Islam Builds in India, Cultural Study of Islamic Architecture", Agam Kala Prakashan, Delhi, (1983).

29. ***Spencer, Trimingham*** "Muslim Saints and Myfics", London, (1964).

30. ***Spear, T.G.P.*** "Delhi - Its Monuments and History", Oxford University Press, London (1945).

31. ***Singh, Nagendra Kumar*** "Islamic Myticism in India", A.P.H. Publication

Corporation, New Delhi, (1996).

32. *Sharma, Y.D.* "Delhi and its Neighbourhood", Archaeological Survey of India, (1964)

33. *Rizvi, S.A.A.* "A History of Sufism in India", 2 Vol., New Delhi, Ist Vol. (1997), IInd Vol. (1992).

34. *Troll, Christian W.* "Muslim Shrines in India", Oxford University Press, New Delhi, (1989).

35. *Tara Chand* "Influence of Islam on Indian Culture", The Indian Press, Allahabad, (1936).

36. *A. Cunnigham* "Archaeological Survey of India", Vol. Ist to XXXIII, Calcutta, (1867-1877).

(اردو)

37. ابن کلیم احسن نظامی "دلی یاترا"، مجلس رہنما ادب سوسائٹی، لاہور، (1988)

38. ابوالاعلیٰ محمد اسماعیل "ولی اللہ"، (لائف آف شاہ ولی اللہ)، جامعہ ملیہ پریس، دہلی

39. ابوالحسن زید فاروقی "مقاماتِ خیر"، اشاعت کردہ درگاہ شاہ ابوالخیر، دہلی، (1989)

40. احمد عروج قادری "اسلامی تصوف"، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، (1980)

41. احمد اختر گورانی "سوانح دہلی"، اردو اکادمی، دہلی، (1999)

42. ارمیسف ناؤ "اسلامی فن تعمیر"، (انگریزی سے اردو ترجمہ) علی گڑھ، (1952)

43. اخلاق حسین دہلوی "آئینہ ملفوظات"، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی، (1983)

44. اسلم فرخی "ارشاداتِ محبوبِ الٰہی"، اشاعت کردہ درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاء، دہلی، (2000)

45. محمد اسلم "ملفوظات ادب کی تاریخی اہمیت"، ادارہ تحقیقات، پاکستان، لاہور، (1995)

46. بدرالدین اسحاق "اسرار الاولیاء" (ملفوظات شیخ فرید الدین گنج شکر)، ترجمہ (فارسی سے اردو) عبدالسمیع ضیا، فریدیہ پبلی کیشن، شہوال، (1978)

47. بشیر الدین احمد "واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی"، جلد-3، اردو اکادمی، نئی دہلی، (1990)

48. تاراچند "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر"، نئی دہلی، (1966)

49. تبارک علی نقش بندی "مرزا مظہر جانِ جاناں، ان کا ادب اور شاعری"، دہلی، (1988)

50. تنویر احمد علوی ”سفرناموں میں دہلی“، اردو اکادمی، دہلی، (1999)

51. خواجہ حسن نظامی ”سیر دہلی“، پانچواں ایڈیشن، دہلی،)1927)

52. خلیق احمد نظامی ”تاریخ مشائخ چشت“، ندوۃ المصنفین، دہلی، (1953)

53. خلیق احمد نظامی ”تاریخ مشائخ چشت“، جلد چہارم، ادارۂ ادبیاتِ دلّی، (1985)

54. خلیق احمد نظامی ”سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات“، ندوۃ المصنفین، دہلی، (1981)

55. خلیق احمد نظامی ”اوراقِ مصور“، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، (1972)

56. خلیق احمد نظامی ”حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی“، ندوۃ المصنفین، دہلی، (1953)

57. خلیق احمد نظامی ”شیخ نظام الدین اولیاء“، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، (1985)

58. خلیق احمد نظامی ”صوفیاءِ کرام اور قومی یکجہتی“، فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، لکھنؤ، (1984)

59. خلیق انجم ”دہلی کی درگاہ شاہِ مرداں“، اردو اکادمی، دہلی، (1988)

60. خلیق انجم ”دہلی کے آثارِ قدیمہ“، اردو اکادمی، نئی دہلی، (1988)

61. راجندر لال ہنڈا ”دلّی جو ایک شہر تھا“، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، (1969)

62. رشید احمد جعفری ”انوار اولیاء (کامل)“، نیو ہالی پبلی کیشن ہاؤس، دہلی، (1986)

63. ریوتی سرن شرما ”دِلّی کی داستان“، ایشیا پبلشر، دہلی، (1957)

64. سید احمد خان ”آثار الصنادید“، جلد-3، اردو اکادمی، نئی دہلی، (1992)

65. شیخ محمد اکرام ”آبِ کوثر“، تاج کمپنی، دہلی، (1991)

شیخ محمد اکرام ”موجِ کوثر“، تاج کمپنی، دہلی، (1991)

شیخ محمد اکرام ”رودِ کوثر“، تاج کمپنی، دہلی، (1991)

66. صابر حسن نظامی ”خواجہ قطب الدین بختیار کاکی“، دہلی، (1376 ہجری)

67. صباح الدین عبدالرحمٰن ”بزمِ صوفیاء“، دارالمصنفین، اعظم گڑھ

68. صباح الدین عبدالرحمٰن ”صوفی امیر خسرو“، المعارف، اعظم گڑھ، (1980)

69. ضیاء الدین دیسائی ”ہند اسلامی طرزِ تعمیر“، (انگریزی سے اردو)، پبلی کیشن ڈویژن، وزارتِ اطلاعات و نشریات، حکومتِ ہند، نئی دہلی

70. ظہور الحسن شارب ”دہلی کے بائیس خواجہ“، تاج پبلشر، دہلی، (1998)

71. غلام ربانی "پرانی یادگاریں"، انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، حیدر آباد، (1950)
72. غلام سرور لاہوری "حدائق الاولیاء"، معارف پریس، لاہور، (1976)
73. غلام یزدانی "ہندستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر"، دہلی، (1937)
74. فیروز شاہ تغلق "فتوحاتِ فیروز شاہی"، (فارسی سے اردو ترجمہ)، مترجم شیخ محمد عبدالرشید، علی گڑھ، (1954)
75. مجاہد حسین زیدی "دہلی"، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، (1965)
76. محمد حبیب "حضرت نظام الدین اولیاء" شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، (1972)
77. محمد عالم شاہ "مزاراتِ اولیاءِ دہلی"، کتب خانہ نظیریہ، دہلی، (1930)
78. مرزا حیرت دہلوی "چراغِ دہلی"، اردو اکادمی، دہلی، (1987)
79. مولانا حکیم سید عبدالحئی "دہلی اور اس کے اطراف"، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی، (1973)
80. مولوی سید احمد "یادگارِ دہلی"، دہلی، (1905)
81. مہیشور دیال "عالم میں انتخاب دہلی"، اردو اکادمی، دہلی، (1987)
82. نثار احمد فاروقی "تذکرۂ خواجہ معین الدین اولیاء"، بختیار پرنٹ، دربار مارکیٹ، لاہور، (1988)
83. نسیم احمد فریدی "خواجہ باقی باللہ فرزند و خلفاء"، لکھنؤ، (1978)
84. یوسف نبھانی "جامِ کراماتِ اولیاء"، مکتبہ جامِ نور، دہلی، (1988)

(فارسی اور فارسی سے اردو)

85. امیر حسن سنجری "فوائد الفواد" (ملفوظاتِ شیخ نظام الدین اولیاء)، (فارسی سے اردو)، مترجم شمس بریلوی، منظور بک ڈپو، دہلی، (1984)
86. امیر خورد کرمانی "سیر الاولیاء" (ملفوظاتِ شیخ نظام الدین اولیاء)، (فارسی سے اردو)، مترجم اعجاز الحق قدوسی، دہلی، (1985)
87. بندہ نواز گیسو دراز "معراج العارفین" (ملفوظات)، (فارسی)، مرتب خلیق انجم، مکتبہ شاہراہ، دہلی، (1957)
88. حامد فیض اللہ جمالی "سیر العارفین" (ملفوظات)، (فارسی سے اردو)، مترجم محمد ایوب قادری، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، (1976)
89. حامد قلندر "خیر المجالس"، ملفوظات نصیر الدین محمود چراغ دہلی، مرتب خلیق احمد نظامی، علی گڑھ
90. حبیب اللہ "ذکر جامع اولیاء دہلی"، (فارسی)، راجستھان ٹونک، (1988)

91. داراشکوہ — ''سفینۃ الاولیاء''، (فارسی سے اردو)، مترجم محمد وارث کامل، صابر بک ڈپو، دیوبند

92. درگاہ قلی خان — ''مرقع دہلی''، (فارسی سے اردو)، مترجم اور مرتب خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، (1993)

93. سنگین مرزا بیگ — ''سیر المنازل''، (فارسی سے اردو)، مترجم اور مرتب ڈاکٹر شریف حسن قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، (1982)

94. شہاب الدین سہروردی — ''عوارف المعارف'' (ملفوظات)، (فارسی سے اردو)، مترجم ابوالحسن، نول کشور پریس لکھنؤ

95. شیخ علی ہجویری — ''کشف المحجوب'' (ملفوظات)، (فارسی سے اردو)، مترجم محمد احمد فاروقی، اسلام بک فاؤنڈیشن، لاہور، (1977)

96. ضیاء الدین برنی — ''تاریخ فیروز شاہی''، (فارسی سے اردو)، مترجم معین الحق، لاہور، (1969)

97. عبدالحق محدث دہلوی — ''اخبار الاخیار''، (فارسی سے اردو)، مترجم دارالعلوم دیوبند، ادبی دنیا، دہلی، (1994)

98. فریدالدین عطار — ''تذکرۃ الاولیاء''، (فارسی سے اردو)، مترجم اختر حجازی، الفیصل پریس، لاہور

99. محمد اکبر حسینی — ''جوامع الکلیم'' (ملفوظات بندنواز گیسودراز)، (فارسی سے اردو)، مترجم معین الدین دردائی، نفیس اکیڈمی، کراچی، (1980)

100. محمد علی — ''جواہر فریدی'' (ملفوظات بابا فرید گنج شکر)، (فارسی سے اردو)، مترجم ملک فضل الدین نقشبندی، کشمیری بازار، لاہور

101. محمد غوثی شطاری — ''گلزار ابرار'' (ملفوظات)، (فارسی سے اردو)، مترجم فضل احمد جے پوری، اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور، (1395ھ)

102. عبدالغنی وارثی — ''طبقات اولیاء''، (فارسی سے اردو)، مترجم نفیس اکیڈمی، کراچی، (1965)،

(ہندی)

103. افضل عباسی — ''تذکرہ اولیاءِ ہند و پاک'' (ہندی)، دہلی، (1988)

104. پرماتما شرن — ''دہلی کی کہانی''، (ہندی)، نئی دہلی

105. تیواری رام پوجن — ''صوفی مت سادھنا اور ساہتیہ''، (ہندی)، دہلی، (1961)

106. چندراولی پانڈے — ''تصوف اتھوا صوفی مت''، (ہندی)، دہلی، (1966)

107. ڈاکٹر حفظ الرحمن — ''تصوف کا اُتکرش ایوم صوفیوں کا اتیہاس''، سنجے پرکاشن، نئی دہلی، (2004)

108. ڈاکٹر حفظ الرحمن — ''تصوف اور شیخ ابوبکر طوسی حیدری قلندری عرف مٹکا پیر، نئی دہلی، (2004)

109. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "دہلی کے بتیس خواجہ کی چوکھٹ"، (ہندی)، نئی دہلی، (2005)

110. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "مقاماتِ اولیاءِ دہلی"، (ہندی)، نئی دہلی، (2005)

111. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "مقاماتِ اولیاءِ روہیل کھنڈ"، (ہندی)، نئی دہلی، (2009)

112. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "تصوف اور خواتین اولیاءِ دہلی"، (اردو)، نئی دہلی، (2011)

113. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن تصوف اور شیخ شرف الدین احمد منیری"، (اردو)، نئی دہلی، (2011)

114. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "فلسفۂ حیات" (اردو، ہندی)، نئی دہلی، (2009)

115. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "مدھیہ کالین بھارتیہ کلا ایوم استھاپتیہ کلا"، (ہندی)، نئی دہلی، (2005)

116. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "تصوف کے دو بڑے ستون: شیخ علی ہجویری اور شیخ شرف الدین احمد منیری"، (اردو) نئی دہلی

117. ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن "اولیاءِ دہلی کی درگاہیں"، (ہندی)، نئی دہلی، (2010)

118. ڈاکٹر رام ناتھ "مدھیہ کالین بھارتیہ کلا اور اس کا وکاس"، راجستھان ہندی گرنتھ اکیڈمی، جے پور، (1973)

119. کوثر یزدانی "صوفی درشن ایوم سادھنا"، (ہندی)، نئی دہلی، (1987)

120. وائی ڈی شرما "دہلی اور اس کا انچل"، (ہندی)، بھارتیہ پراتتو سرویکشن، نئی دہلی، (1992)

Some Published Books Related to

Sufis Tazkirah And Dargas

By

Dr. Mohammad Hifzur-Rahman

Under The Research Plan Of

(Universal Sufi-Saints Study And Peace Foundation)

New Delhi.25

صوفی مطالعاتی و امن فاؤنڈیشن (رجسٹرڈ)

MAQAMAT-E-AULIA-E-RUHAIL KHAND,(Hindi), Tazkirah-e-Sufia-e-Amroha, Muradabad, Rampur, Bijnaur, Published by MR Publication, Dariya Ganj, Delhi, (2009).

MAQAMAT-E-AULIA-DEHLI (Hindi), A Survey of Dillid Dargas, Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, (2005).

MAZARAT-E-AULIA-E-DEHLI,(Urdu), Tazkirah-e-Sufiya-e-Dehli, Published by Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, 2006.

AULIY-E-DEHLI KI DARGAHEN,(Hindi),(A Documentary Works of Delhi's Dargas 390 pages) Delhi,(2011).

TASAWWUF AUR SUFIYA KI TARIKH ARAB SE HINDUSTAN TAK, (Urdu), Under Print.

TASAWWUF AUR SHAIKH ABU BAKAR TUSI HAIDARI QALANDAR URF MATKA PEER, at Pragati Maidan, Delhi, (Urdu&Hindi), Published by Dargah-e-Matka Peer, Dehli,(2005).

TASAWWUF KA UTKARSH EWAM SUFIYON KA ITIHAS, (Hindi), Published by Sanjay Parakashan, New Delhi,(2004).

DILLI KE 32 KHWAJA KI CHAUKHAT,(Hindi), Tazkirah-e-Sufiya-e-Dehli, A Documentary Study, Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, (2005).

DARGAH-E-SULTAN-UL-HIND, KHWAJA MOINUDDIN CHISHTI AJMERI KI DARGAH AUR AJMER KE AASAR-E-QADIMA, (Urdu). Under Print.

FALSAF-E-HAYAT(Urdu), And ***JEEVAN DARSHAN***(Hindi), Published by Universal Sufi Sant Study and Peace Foundation, Jamia Nagar, New Delhi, (2009).

TASWWUF AND ITS SOURCES (English), Published by Idarah-i-Ababiyat Delhi, Under Print.

TASWWUF AND HISTORY OF SUFI MOVEMENTS (Arab to India), (Eng), under print.

TASWWUF AUR SHAIKH SHARFUDDIN AHMAD MANERI,(Urdu), Life and Works of Shaikh Sharfuddin Bin Yahya Maneri, Delhi, (2011).

TASWWUF KYA HAI (Hindi) Published in Journal Khuda Bakhsh Library, Patna, (2005).

TASWWUF AUR SUFIYA KE KIRDAR-E-AMAL AUR MUSALMANON MEIN EKHTILAF,(Urdu) Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, (2006).

HINDUSTAN MEIN SUFI TAHRIK KA UTKARSH AUR SUFIYON KA YOGDAN (Hindi), Published in Journal Khuda Bakhsh Library, Patna, (2006).

TASWWUF AUR KHAWATEEN-E-AULIYA,(Urdu) Published by M.R. Pablication, Darya Ganj, Delhi, (2011).

TASWWUF KE DO BADE SATOON SHAIKH ALI HUJAVARI, AUR SHAIKH SHARFUDDIN AHMAD BIN YAHYA MANERI (Urdu). Delhi, 2012.

DILLI KE BATTIS KHWAJA KI CHAUKHAT, (Urdu) Under Print.

AULIYA-E-DEHLI KI DARGHAHEIN, (Urdu) Under Print.

BOOKS ON THE HISTORY AND ISLAMIC ARCHITECTURE

MADHYA KALEEN KALA EVAM ASTHAPATTYA KALA, (Visheshtayein Avam Vikaas) (Hindi), Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, (2005).

RUHAIL KHAND ITIHAS EVAM SANSKIRITI, (Hindi), Published by Farid Book Depo, Darya Ganj, Delhi, (2006).

MADHYA KALEEN AMROHA, *Under Print.*

MAIN RAMPUR HOON, *Under Print.*

☆☆☆